ندائے خلافت

لاہور

- افغانستان کا خونیں منظر اور تاریخی پس منظر
- سالانہ اجتماع کے ایک "مبصر" کا تبصرہ
- مغرب نے جمہوریت کی تہمت ہمارے سر کیوں ڈالی؟

اشاعتِ خاص
قیمت ۶/-

تربیت و تزکیہ

نواں سبق

عبادت رب

برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں پر انگریز کی سو سالہ حکمرانی کے جہاں دیگر بہت سے مضر اثرات مترتب ہوئے وہاں ان کا تصور دین بھی بری طرح متاثر ہوا۔ عبادت رب کا وسیع تر تصور چند مراسم عبودیت یعنی نماز ' روزہ' حج اور زکوٰۃ تک محدود ہو کر رہ گیا ۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ چاروں ارکان اسلام عبادت کا ایک جزو ہیں اور انسان کو زندگی کے تمام معاملات میں اللہ کی بندگی اور فرمانبرداری کے لئے تیار کرتے ہیں۔

دیگر خود ساختہ مذاہب کے مقابلے میں اسلام میں عبادت رب کا تصور بہت جامع اور مکمل ہے ۔ ایک غلام کا اپنے مالک کا محض حکم ماننا اطاعت کہلا سکتا ہے عبادت نہیں ۔ عبادت کا جزو لازم محبت ہے ۔ حد درجے کی محبت کے نتیجے میں فرمانبرداری اصل میں عبادت کہلانے کی مستحق ہے ۔ محبت معرفت سے پیدا ہوتی ہے' جیسے جیسے انسان اپنے خالق و مالک کی صفات سے واقفیت حاصل کرتا ہے اس کی محبت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ جو لوگ اپنے رب کو دل سے مانتے ہیں وہ اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔

عبادت رب کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ فرمانبرداری زندگی کے تمام معاملات اور جملہ گوشوں میں مطلوب ہے ۔ اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ یہ رویہ کہ کچھ معاملات میں تو بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ فرمانبرداری لیکن اسی پروردگار کے کچھ احکام پاؤں تلے ' نہ صرف یہ کہ قابل قبول نہیں ہے بلکہ اس رحیم و غفور ہستی کے ساتھ بہت بڑا مذاق بھی ہے اور اس کے غضب کو بھڑکانے کا باعث بھی ۔ یہ انداز اگر ہمارا کوئی ملازم ہمارے ساتھ اختیار کرے تو ہم اسے ایک منٹ کے لئے بھی ملازم رکھنے پر آمادہ نہیں ہونگے لیکن مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کی بندگی اگر کر بھی رہے ہیں تو اپنی پسند کے چند معاملات میں اور باقی تمام امور میں اپنے نفس ' معاشرے کے رواج اور شیطان کی پرستش ہو رہی ہے ۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس کی بندگی کرنے والے شخص کا تذکرہ بایں الفاظ کیا ہے کہ اے نبیؐ کیا آپ نے اس شخص کی حالت پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیا ۔ یہ انداز بندگی نہ صرف پسندیدہ اور قابل قبول نہیں بلکہ مستوجب سزاء ہے ۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے کہ کیا تم کتاب اللہ کے ایک حصے کو مانتے ہو اور دوسرے کا انکار کرتے ہو ۔ ایسا رویہ اختیار کرنے والوں کی سزا اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ انہیں اس دنیوی زندگی میں ذلیل و رسوا کردیا جائے اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف لوٹا دیا جائے ۔

آج مسلمان امت جس طرح دنیا میں ذلیل و رسواء ہو رہی ہے وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ہم عبادت رب کے تقاضے پورے نہیں کر رہے۔ آیئے ہم اپنے رب سے عہد کریں کہ اے اللہ ہم عبادت کی چند مخصوص صورتوں پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کے دیگر تمام معاملات میں بھی جو ہمارے اختیار میں ہیں تیری فرمانبرداری اختیار کریں گے ۔ تاکہ ہماری دنیوی ذلت و رسوائی کا باب ختم ہو اور ہم ایک بار پھر پوری دنیا پر اللہ کے دین کو غالب کرنے میں کامیاب ہوسکیں ۔ ○

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت کے

دروس و خطابات کے پروگرام

یکم مئی بروز جمعۃ المبارک ' ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے

خطاب جمعہ ' مسجد دار السلام باغ جناح لاہور " محنت مزدوری کی عظمت"

یکم مئی بعد از نماز مغرب

برکت علی اسلامیہ ہال بالمقابل موچی گیٹ بعنوان نظام خلافت میں مزدوروں کے حقوق

۲ر مئی بروز ہفتہ بعد نماز مغرب

قرآن آڈیٹوریم اتاترک بلاک گارڈن ٹاؤن لاہور میں قرآن مجید کے منتخب نصاب کے درس کا از سر نو آغاز

۴ر مئی بروز پیر : پشاور میں بار ایسوسی ایشن سے خطاب

۸ر مئی بروز جمعہ ' بارہ بجے دوپہر

خطاب جمعہ جامع قرآن اکیڈمی ملتان واقع ۲۵ر آفیسرز کالونی ' نزد چونگی نمبر۹

شفق نہیں مغربی اُفق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے

وقت کی سانس پھر رک سی گئی ہے ' کارگہ شیشہ گری میں شاید پھر کوئی بہت نازک کام ہو رہا ہے ۔ ہمارے بہت قریب اسلام کے نام پر ۱۳ سال جاری رہنے والی مسلح مزاحمت کامیابی کے مراحل میں داخل ہو گئی ہے جو نظریات کے تصادم اور جہاد حریت سے ہوتی ہوئی بظاہر قتال فی سبیل اللہ تک پہنچی تھی ۔ اس طویل جدوجہد میں لاکھوں نے ہجرت کی ' گھروں سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور ہر نوع کی ایذائیں برداشت کیں ۔ لاکھوں نے ہی اپنے خون سے سر فروشی کی داستان میں ایک نئے باب کا اضافہ بھی کیا ۔ مجاہدین افغانستان نے بیسویں صدی کے ان آخری عشروں میں دنیا کو اپنے جذبوں کی صداقت سے ششدر کردیا ۔ ان کی شجاعت نے اپنا لوہا منوایا اور ایک عالمی سپر پاور کو موم کی طرح پگھلا کر رکھ دیا ۔ صدیوں بعد روئے ارضی پر اسلام کے نام پر ایک جنگ جیتی گئی ہے اور یہ اس وقت ہوا جب زمانے کے انداز بدل چکے تھے ' نظریے اور اعتقادات کتابوں کی زینت بن کر رہ گئے اور عمل کی دنیا میں سنگ و آہن کا سکہ رواں تھا ۔ معرکہ روح و بدن میں روحانیت کی شکست ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر تسلیم کرلی گئی تھی اور تاریخ نے اپنے تئیں اس نوع کے جہاد کا باب گویا ہمیشہ کے لئے بند کردیا تھا ۔

لیکن یہ کیا !۔ ہماری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں ' کان کیا سن رہے ہیں !۔ کامیابی و کامرانی کی منزل کے قرب و جوار میں پہنچ کر مجاہدین باہم دگر دست و گریباں ہوگئے ہیں اور المیہ یہ ہے کہ اس میں اغیار کی سازشوں کا عمل کم اور اپنوں کی ستم رانیوں کا دخل زیادہ ہے ۔ اسلامی جہاد اب اقتدار کی جنگ میں بدلتا نظر آتا ہے اور مجاہدین ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگے ہیں ۔ درست کہ قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ انقلاب سب سے پہلے اپنے بچوں کو ہی نگلتا ہے لیکن اسلامی انقلاب کا "ڈراپ سین" تو یہ نہیں ہونا چاہیے تھا ۔ اس میں تو دشمنوں کو بھی "**لاتثریب علیکم الیوم**" کی بشارت دی جاتی ہے ' اپنوں میں سر پھٹول کیا معنی !۔ کہیں اس تعمیر میں خرابی کی کوئی صورت تو مضمر نہ تھی جو بنیاد میں تو دفن کردی گئی ' آخری منزل میں آکر گل کھلا رہی ہے ۔

وقت نے ایک بار پہلے بھی اپنی سانس روک لی تھی ' یہ ۱۹۴۷ء کی ۱۳ اور ۱۴ اگست کی درمیانی شب کی بات ہے جب تاریخ اور جغرافیے دونوں کو شکست دے کر اسلام کے نام پر ایک نیا ملک عالم وجود میں آیا ۔ یہ معجزہ بھی دنیا نے دم سادھے دیکھا کہ اس زمانے میں جب جدید عمرانیات کے اصولوں نے نئے بت تراش لئے تھے ' خود نظریہ حیات جیسی جامد شے میں جان ہی نہیں پڑ گئی بلکہ اس نے ایک مردہ قوم میں زندگی کی نئی لہر بھی دوڑا دی ۔ یہ بھی معاصر تاریخ کا ایک منفرد واقعہ تھا لیکن اس خوشگوار حادثے پر ۴۵ سال گزرنے کے بعد بھی اس نئے ملک..... پاکستان ... میں اسلام ہی سب سے بڑھ کر مظلوم ہے ۔ اسلام یہاں وہ تہمت بن گیا ہے جسے کوئی بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ۔ ایک نظریہ حیات نے جس قوم کے اجزائے پریشاں کو یک جان کیا تھا ' اسے نظر انداز کیا گیا تو عصبیتوں کے عفریت صحن وطن میں ناچنے لگے ... علاقائی عصبیت ' لسانی عصبیت ' نسلی عصبیت اور نہ جانے کیا کیا ... ملک خداداد دو لخت تو ہو ہی چکا ہے ' آثار اب بھی اچھے نہیں ۔ افغانیوں پر بھی وہی بلائیں چڑھ دوڑی ہیں جنہوں نے ہمیں چت کیا ۔ وہی دیرینہ بیماری ' وہی ناپختگی دل کی ۔

یہ ہمارے مشاہدات ہیں ' ہمارے اندیشے ' ہمارے وسوسے لیکن کیا عجب اللہ کی مشیت میں اس خطے کے لئے جو کردار مقدر ہے اس کے لئے یہ شکست و ریخت ضروری ہو ۔ سوتے کو جگانے کے لئے ہلانا جلانا کافی ہوجاتا ہے لیکن جاگتے کو اٹھانے کے لئے جھٹکے درکار ہیں ۔ آخر میر عرب کو ٹھنڈی ہوا اسی طرف سے تو آئی تھی ۔ اسلام جب خود اپنے گھر میں دشمنوں کے نرغے میں گھر جائے گا تو ہاتھوں میں اللہ کے دین کے علم اٹھائے لشکر "خراسان" ہی سے اس کی نصرت کو پہنچیں گے اور خراسان اس خطے کا نام ہے جس میں پاکستان شامل ہے ' افغانستان اس کا حصہ ہے اور وسط ایشیا کی نو آزاد مسلمان ریاستیں بھی اسی جگر لخت لخت کے ٹکڑے ہیں ۔ لیکن اس نوید جانفزا کا مصداق بننے کے لئے اس علاقے میں رہنے والے بہت سے لوگوں کو کمر ہمت کس لینی ہوگی جن کا دل اسلام کی "غربت" پر کڑھتا ہے کیونکہ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی ' نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کو بدلنے کا ۔ مسلماں کو مسلماں کرنے کا کام ہمیں خود ہی کرنا ہوگا کیونکہ تہذیب حاضر نے تو ہمیں اور ہی گورکھ دھندوں میں ڈال دیا ہے ۔ ہم اسی عطار کے لونڈے سے دوا لینے نکلتے ہیں جس کے سبب بیمار ہوئے جبکہ ہمارے مرض کا علاج صرف اور صرف قرآن کی طرف رجوع کرنے میں ہے جو سینوں کے اندر چھپے ہر روگ کے لئے شفائے کاملہ کا واحد نسخہ ہے ۔

ہم نے پاکستان میں بہت ٹھوکریں کھالیں ' ہمارے بھائی افغانستان میں ایک نئی افتاد میں مبتلا ہوتے نظر آرہے ہیں ' ادھر کشمیر جنت نظیر مسلمانوں کے لئے جہنم بنی ہوئی ہے ' بھارتی مسلمان جنہیں ہم نے فراموش کردیا رام راج کی زد پر ہیں اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے دلوں کو ابھی پیغام سجود یاد نہیں آیا ۔ جہان نو پیدا ہو رہا ہے لیکن عالم پیر مرنے پر تیار نہیں ۔ ناسازگاری حالات کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مایوسیوں کی آندھیوں کے سامنے احیائے اسلام کی امید کا چراغ جلانا بظاہر بڑا ہی دل گردے کا کام ہے لیکن امیر تنظیم اسلامی پاکستان ' ڈاکٹر اسرار احمد کے بقول آخر اسی شر میں سے خیر برآمد ہوگا بشرطیکہ احساس فرض ہمیں اٹھ کھڑا ہونے اور کچھ کرنے پر مجبور کردے ۔ گویا آج کی صورت حال میں جب افق مسلمانوں کے خون سے گل رنگ ہے ' ان کا پیغام یہ ہے کہ ۔

اگر "افغانیوں" پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے　　کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

تا خلافت کی بِنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ ندائے خلافت لاہور

جلد ۱ شمارہ ۱۴-۱۵

۱۴ مئی ۱۹۹۲ء

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی

مرکزی دفتر: ۶۷-اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور

مقامِ اشاعت
۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون :- ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد ، طابع: رشید احمد چودھری
مطبع: مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ، لاہور

قیمت فی پرچہ -/۳ روپے

سالانہ زر تعاون (اندرونِ پاکستان) -/۱۲۰ روپے

زر تعاون برائے بیرونِ پاکستان

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت —— ۱۶ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش —— ۱۲ " "
افریقہ، ایشیا، یورپ —— ۱۷ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا —— ۲۰ " "

اس اشاعت خاص کی قیمت ۶ روپے

الہدیٰ

(سورۃ البقرہ آیت نمبر۹۱۔۹۲)

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس چیز پر جو اللہ نے نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان رکھتے ہیں اس چیز پر جو ہم پر نازل کی گئی اور وہ انکار کرتے ہیں اس کا کہ جو اس کے سوا ہے' حالانکہ وہی کتاب سچی ہے اور تصدیق کرتی ہے اس کی کہ جو ان کے پاس ہے'

(کہ یہود کو جب قرآن حکیم پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی تھی تو بڑے ہی شان استغناء کے ساتھ اور متکبرانہ لہجے میں کہتے تھے کہ ہم تو بس اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری جانب نازل کی گئی تھی یعنی تورات' اس ایک کتاب کے سوا ہم کسی اور کتاب پر ایمان لانے والے نہیں' خواہ وہ انجیل ہو یا قرآن حالانکہ اپنے دل میں وہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ یہ قرآن حق ہے اور اس کی حقانیت کا ایک نمایاں مظہر یہ ہے کہ یہ ان تعلیمات کی تصدیق کرتا ہوا آیا ہے جو تورات میں موجود تھیں!)

کہو' پھر تم اللہ کے پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے رہے ہو اس سے پہلے' اگر تم ایمان رکھتے تھے○

(ذرا ان سے پوچھئے کہ اگر تم فی الواقع تورات پر ایمان رکھتے ہو تو تم اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کر رہے ہو' جبکہ تورات میں یہ حکم موجود ہے کہ اللہ کا جو نبی تورات کو سچا بتائے تم اس کی نصرت کرنا اور اس پر ضرور ایمان لانا' اور تم اس سے پہلے حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کو قتل کر چکے ہو حالانکہ وہ دونوں تورات کی نہ صرف یہ کہ تصدیق کرتے ہوئے آئے تھے بلکہ اسی کی ترویج کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ تمہارے کرتوت اس بات کا واضح مظہر ہیں کہ تم تورات پر بھی ایمان نہیں رکھتے!! ر تورات پر ایمان کا تمہارا دعویٰ بھی صریحاً بے بنیاد ہے۔)

اور آچکے ہیں تمہارے پاس موسیٰ کھلی کھلی نشانیاں لے کر' پھر تم نے ان کے بعد بچھڑے کو اختیار کر لیا اور تم ظلم ڈھانے والے بنے○

(کہ وہ حضرت موسیٰؑ جن کے تم نام لیوا ہو اور جن کی لائی ہوئی شریعت کے بزعم خویش تم پیرو کار ہو' ان کے ساتھ تمہاری وفاداری کا یہ عالم تھا کہ ان کے ہاتھوں صادر ہونے والے کھلے کھلے معجزات دیکھنے کے باجود وہ جب تورات لینے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو تم نے ان کی عدم موجودگی میں بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ اور ان کی شریعت پر تمہارا وہ ایمان کیا ہوا تھا؟ اور آج رسول آخر الزمان کے بغض و حسد میں تم شریعت موسوی کو یوں گلے سے لگائے ہوئے ہو کہ تم اس اللہ کا حکم سننے کے بھی آج روا دار نہیں ہو' جس نے موسیٰ کو تورات اور شریعت عطا کی تھی۔ تمہارا ظالم ہونا ہر شک و شبے سے بالا تر ہے)

افغانستان کا خونیں منظر اور تاریخی پس منظر

کیا تقسیم اور خانہ جنگی کو روکا جا سکے گا!

جہاد کے تیرہ سالوں میں افتراق بڑھتا چلا گیا

بدلتی صورت حال میں ایک ہفتے کے فصل سے لکھے گئے عبدالکریم عابد کے دو تجزیے

افغانستان بہ حیثیت ایک ملک باقی رہ سکے گا؟۔ کیا اس میں امن قائم ہو سکے گا؟۔ یا یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم اور باہم متصادم علاقہ ہوگا جہاں بڑے پیمانے کی خونریزی جاری رہے گی ؟۔ اگر افغان رہنما متحد نہیں ہوتے تو افغانستان کے لئے کسی اچھے انجام کی امید نہیں کی جاسکتی۔ یہ ایسا ملک نہیں ہے جو تاریخ میں صدیوں سے موجود رہا ہو' اسے مغل سلطنت کے دور زوال میں نادر شاہ کے ایک جنرل احمد شاہ ابدالی نے قائم کیا تھا۔ یہ ملک اسے اس کی خدمات کے انعام کے طور پر دیا گیا۔

احمد شاہ ابدالی کا ہم برصغیر کے مسلمانوں پر بڑا احسان ہے کہ اس نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے کہنے پر ہندوستان میں جنگ پانی پت لڑی اور مسلمانوں کی دشمن طاقت کو ایسا نیست و نابود کیا کہ وہ پھر کبھی سر نہیں اٹھا سکے۔ اس جنگ میں ہلاک ہونے والے مرہٹہ فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے۔ ان کی قوت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ مغل دربار کو انہوں نے گردن سے پکڑ رکھا تھا۔ چوتھ کے نام سے ایک ٹیکس وصول کرتے تھے اور ہندوستان میں اقتدار کا جو خلا پیدا ہو رہا تھا اسے پر کرنے کے لئے یہ مرہٹہ طاقت آگے بڑھ رہی تھی اور عین ممکن تھا کہ انگریزوں سے پہلے ہم ان مرہٹوں کے غلام ہوجاتے کیونکہ ہم میں تو حکمرانی کی صلاحیت رہی نہیں تھی۔ اسی لئے گو مرہٹہ ختم ہوگئے لیکن سکھوں نے ملتان سے کابل تک اپنی حکومت قائم کر لی تھی اور ان سکھوں کو ختم کرنے کے لئے کوئی احمد شاہ ابدالی موجود نہیں تھا کیونکہ تاریخ اپنا ایک باب ختم کرچکی تھی' دوسرا شروع کرنے والی تھی۔

اس نئے باب کا آغاز فرنگی کے اقتدار سے ہوا لیکن دور فرنگ میں ہم ہندوستانی مسلمان ہمیشہ افغانستان کی جانب امید بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ خاص طور پر علمائے دیو بند کا خیال تھا کہ افغانستان سے کوئی لشکر اسلام ضرور نمو دار ہوگا اور ہمیں آزادی دلائے گا لیکن ریشمی رومال سازش کی ناکامی کے بعد یہ امید ختم ہوگئی اور ہمارے رہنماؤں نے سمجھ لیا کہ انگریز کو ہتھیاروں سے نہیں' عدم تشدد کے حربے سے شکست دی جاسکتی ہے۔ اسیر مالٹا مولانا محمود الحسن نے گاندھی کا شکریہ بھی ادا کیا کہ انہوں نے مسلمانوں کو عدم تشدد کا وہ بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا جس کا مظاہرہ مکی زندگی میں کیا گیا تھا۔ غفار خاں بھی عدم تشدد کا جھنڈا اٹھا کر سرحدی گاندھی بن گئے اور قائد اعظم تو تھے ہی مجسم عدم تشدد' وہ گاندھی سے کہیں زیادہ آئین پسند اور قانون پسند رہنما تھے۔ انہیں آئین و قانون کی خلاف ورزی زرہ برابر بھی پسند نہیں تھی کیونکہ وہ ایک شوریدہ سر قوم پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے' ایک ڈسپلن والا معاشرہ دیکھنا چاہتے تھے۔

اس کے برعکس افغانستان کی صورت حال برصغیر سے مختلف تھی۔ وہاں آئینی تحریکوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ افغان قبائل کے مزاج میں تشدد کو بڑا دخل تھا' وہ نہ صرف لڑائی بلکہ خوشی کے موقع پر بھی بندوقیں چلا کر اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔ ہندوستان کی سرحد پر فقیرا یپی کی قیادت میں افغان قبائلی انگریز انتظامیہ سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھتے تھے۔ انہوں نے آزاد علاقہ بھی بنا رکھا تھا اور انگریز کا پولٹیکل ایجنٹ قبائلی سرداروں کو قابو میں رکھنے کے لئے کافی رقم سرداران قبائل میں تقسیم کرتا تھا لیکن افغانستان میں اندرونی طور پر بادشاہت کو عوام اور خواص میں ایک مسلمہ حیثیت حاصل تھی اور یہ ادارہ ملک میں امن اور استحکام رکھنے میں کامیاب تھا۔

مگر بہت جلد پختون نیشنلزم نے سر اٹھایا۔ اسے پختونستان کے نعرہ سے بھی مدد ملی اور اس پختون نیشنلزم سے خوف زدہ ہو کر ظاہر شاہ نے امداد کے لئے پاکستان کی جانب دیکھنا شروع کیا۔ اس موقع پر سردار داؤد نے ان کا تختہ الٹ دیا۔ سردار داؤد بادشاہت کے نظام کو ختم کر کے کوئی دوسرا نظام قائم نہیں کرسکے۔ بادشاہت کے دور میں حکومت کے انداز میں اعتدال اور شائستگی تھی لیکن سردار داؤد ایک مغلوب الغضب حکمران تھے اور مخالفین کو وحشیانہ سزائیں دیتے تھے۔ ابتدا میں

تو ان کا پختون نیشنلزم سے نباہ ہوتا رہا لیکن بہت جلد یہ بھی نیشنلسٹ رہنماؤں سے خطرہ محسوس کرنے لگے اور خطرہ بڑھ گیا تو پاکستان سے اچھے تعلقات کے لئے اسلام آباد پہنچ گئے اور ۷ر مارچ ۱۹۷۸ء کو انہوں نے اسلام آباد میں اعلان کیا کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان تمام شکوک و شبہات دور ہوگئے ہیں اور ہمیں اندازہ ہوگیا ہے کہ دونوں ملکوں کا مستقبل مشترک ہے۔

۲۷ر اپریل ۱۹۷۸ء یعنی دورہ اسلام آباد کے چند ہفتوں بعد سردار داؤد کو قتل کردیا گیا اور روس کے کٹر حامیوں نے اقتدار سنبھال لیا۔ یہ روس کے حامی کون تھے؟۔ روس کے نئے دانشور کہتے ہیں کہ یہ لوگ روس کے نہیں امریکہ کے آدمی تھے۔ وہ روسی اور کیمونسٹ نقاب میں اس لئے اقتدار پر آئے تھے کہ کسی طرح روس کو بہلا پھسلا کر افغانستان کے جال میں پھنسا لیں اور یہ اس کے لئے ایک ویٹنام ثابت ہو۔ اس سازش کے تحت حفیظ اللہ امین بھی قتل کر دئے گئے اور روس کی فوج افغانستان میں داخل ہوگئی۔ حفیظ اللہ امین نے بھی آخری وقت میں ظاہر شاہ اور سردار داؤد کی طرح پاکستان کی جانب مدد طلب نگاہوں سے دیکھا اور آغا شاہی اسی سلسلے میں کابل گئے مگر ان کا طیارہ برف باری کی وجہ سے اتر نہیں سکا اور روس نے مہلت نہیں دی۔ حفیظ اللہ امین کے قتل اور روس کے افغانستان میں داخلہ کے بعد افغان جہاد کا دور شروع ہوا جو تیرہ سال بعد آج بھی جاری ہے۔ اگرچہ روس تین سال پہلے افغانستان سے نکل گیا تھا، مگر جنرل نجیب کی حکومت باقی تھی اور اب وہ بھی ختم ہوگئی ہے تاہم افغان مسئلہ کا حل سامنے نظر نہیں آرہا ہے۔

افغان جہاد کے سلسلہ میں پہلی حقیقت یہ ہے کہ اس جہاد کا انحصار مسلمانوں کے یا افغانوں کے اپنے زور بازو پر نہیں تھا۔ اس کے لئے امریکہ روپیہ اور اسلحہ دیتا رہا جس کے سٹنگر میزائل جہاد میں فیصلہ کن عنصر ثابت ہوئے۔ امریکہ ہی کے ایما پر یورپ اور مسلمان ملکوں نے بھی افغان جہاد کے لئے مدد فراہم کی، اور جب امریکہ اور روس نے جنیوا میں سمجھوتہ کر لیا کہ اس محاذ پر ہماری جنگ ختم ہوگئی ہے اور ہم کسی کی امداد نہیں کریں گے تو پاکستان مشکل میں پڑ گیا کہ وہ کیا کرے؟۔ جنرل ضیاء نے پہلے جنیوا سمجھوتہ کو ماننے سے انکار کیا، بعد میں مجبور ہو کر مان لیا لیکن مجاہد تنظیموں کا دباؤ تھا کہ کابل کی فتح کے لئے ہماری امداد جاری رکھو۔ جنرل ضیاء کا رجحان مجاہدین کی تائید میں تھا اس لئے انہیں طیارہ کے حادثہ کے ذریعے راستے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے باوجود فوج کا ادارہ اور خاص طور پر آئی ایس آئی میں مجاہدین کی مدد جاری رکھی۔ اب روس کو نکلے تین سال گزر گئے مگر مجاہدین کابل، قندھار، جلال آباد کوئی شہر بھی فتح نہیں کرسکے۔

جلال آباد پر حملے کی ناکامی کے بعد پاکستان کے ذمہ دار حکام میں یہ سوچ پیدا ہوئی کہ سیاسی تصفیہ کی راہ اختیار کرنے میں ہی عافیت ہے اور جنرل آصف نواز نے امریکہ پہنچ کر یہ بتایا کہ پاکستان سیاسی تصفیہ کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے اور جنگ و جدل کے چکر سے نکلنا چاہتا ہے جس میں وہ پھنس گیا ہے۔ یہی بات وزیراعظم نواز شریف یوں کہہ رہے ہیں کہ افغان جہاد کے تمام مقاصد حاصل کرلئے گئے ہیں اور اب سیاسی تصفیہ ہونا چاہیے۔ پاکستان سے پہلے ہی ایران نے اعلان کر رکھا ہے کہ وہ سیاسی تصفیہ کے لئے اقوام متحدہ کی کارروائیوں کی حمایت کرتا ہے۔ سعودی عرب اور دوسرے مسلمان ملک بھی اب جہاد کے شوقین عناصر کو کسی طرح کی مدد دینے کے لئے تیار نہیں ہیں مگر امریکہ، روس، یورپی ممالک اور مسلمان ممالک خواہ کتنا ہی چاہیں وہ افغانستان میں امن قائم نہیں کرسکتے۔ امن کا انحصار خود مجاہد تنظیموں پر ہے۔ اگر وہ متفق اور متحد ہو کر کوئی فارمولا مانتے یا منواتے نہیں ہیں تو خانہ جنگی جاری رہے گی جس میں مجاہد تنظیمیں کسی کافر کے خلاف بر سر پیکار نہیں ہونگی بلکہ آپس میں ایک دوسرے کا گلا کاٹیں گی۔ اب بھی یہی ہو رہا ہے اور مسلمانوں کے درمیان گردن کشی کا یہ عمل آنے والے دنوں میں مزید تیز ہوسکتا ہے کیونکہ افغانستان میں چھوٹے بڑے کئی مسلح گروہ ہیں اور کوئی بھی اپنے آپ کو کم نہیں سمجھتا۔ سب کا یہ خیال ہے کہ ہم چوما دیگر نیست۔ سب کو اپنے اپنے ہتھیاروں پر زعم ہے۔ ان کے درمیان قبائلی، نسلی، لسانی اور فرقہ ورانہ اختلافات کا بازار بھی گرم ہورہا ہے۔

شمالی افغانستان میں ملک کی پچیس فی صد تاجک اور دس فی صد ازبک آبادی ہے۔ ان کے درمیان وسط ایشیا کی آزادی کے بعد آزاد تاجکستان اور آزاد ازبکستان کے نعرے بھی گونج رہے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو سرحد پار دیکھ رہے ہیں۔ ان میں پختونوں کے خلاف تعصب بھی ہے اور خوف بھی، شمالی علاقوں میں ازبک تاجک عناصر اور کمانڈر مسعود کی مجاہد تنظیم میں حکمت یار گروپ کے خلاف نیا اتحاد قائم ہوگیا ہے۔ ایران بھی سرگرم ہے شاہ ایران کے زمانے میں ایران افغانستان پاکستان کی کنفڈریشن کی تجویز تھی جس کے لئے شاہ نے کابل اور اسلام آباد میں کافی بھاگ دوڑ کی تھی مگر تجویز پروان نہیں چڑھ سکی تاہم ایران کے افغانستان میں مخصوص عزائم ہیں اور وہاں مذہبی طور پر شیعہ اور لسانی طور پر فارسی بولنے والی آبادی میں اس کا اثر موجود ہے۔

تہران میں ایران کی حامی گیارہ مجاہد تنظیموں کا اتحاد "اخوت" کے نام سے قائم ہے اور نجیب اللہ کے اقتدار کے خاتمے میں بھی ایران کے پس پردہ سرگرمیوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ افغانستان کی اس تیرہ سالہ جنگ میں چودہ لاکھ افراد ہلاک ہوگئے ہیں، لاکھوں بچے، بوڑھے، جوان کھلونا نا بموں اور بارودی سرنگوں سے ہمیشہ کے لئے اپاہج ہوگئے، لکھو کھا افراد بے خانماں ہو کر پاکستان میں پڑے ہیں اور ان کی واپسی کے راستے بھی مسدود ہیں کیونکہ افغانستان کی سرزمین پر جگہ جگہ بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں جن کو صاف کرنے کے لئے کروڑہا کی رقم درکار ہے۔ پھران کی وہاں دوبارہ واپسی اور آباد کاری کے لئے بھاری رقم درکار ہوگی۔ دنیا یہ رقم اس وقت فراہم کرے گی جب افغانستان میں امن ہو۔ اگر خونریزی جاری رہتی ہے تو مغربی ممالک کا رویہ یہ ہوگا کہ افغان قوم بھاڑ میں جائے، یہ ایک دوسرے کی گردہ کاٹتے رہیں، ہم کیا کرسکتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ بڑے پیمانے پر اقوام متحدہ کی فوج افغانستان کے لئے تشکیل دی جائے۔ اس کے لئے کوئی رقم دینے پر تیار نہیں ہوگا۔ پہلے ہی یوگوسلاویہ کمبوڈیا وغیرہ میں اقوام متحدہ کی امن فوج کے لئے بجٹ نہیں مل رہا ہے۔

پھر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ افغانستان جیسے ملک میں اقوام متحدہ کی فوج کر کیا سکے گی؟۔ ایک سوال یہ ہے کہ جو مسلح جتھے ہیروئن کی کاشت، سمگلنگ، اسلحہ کی تجارت میں ملوث ہیں وہ امن اور استحکام کو کیا اپنی موت خیال نہیں کریں گے اور اس کے لئے ان کا تعاون کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟۔ پاکستان کو ایک دشواری یہ درپیش ہے کہ افغان مہاجرین کو اپنے پاس رکھے تو کھلائے کہاں

سے؟۔ اب کوئی بیرونی مدد نہیں مل سکتی۔ پھر ان مہاجرین' مجاہدین کو کھانے کے لئے نہیں ملے گا تو یہ پاکستان ہی کے علاقے میں لوٹ مار کا بازار گرم کرسکتے ہیں۔ ڈیورنڈ لائن کی سرحد تو عملاً ختم ہو ہی گئی ہے' یہ بھی ممکن ہے کہ افغانستان کی لسانی تقسیم ہو اور پختون علاقہ الگ ہو کر پاکستان کے پختون علاقے کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرے۔ یہ پاکستانی پختون سرحد میں بھی ہیں اور بلوچستان میں بھی۔

غرضیکہ افغان جہاد کے خاتمے پر منظر خوش آئندہ نہیں' تشویش انگیز اور وحشت افزاء ہے۔ اس کا علاج غیروں کے پاس نہیں' ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے کہ مجاہدین کے سربراہ عقل سے کام لیں' ایک دوسرے کے ساتھ ہم قدم ہو کر چلنے کی کوشش کریں اور پاکستان کو بھی ایسی مزید آزمائش اور مصیبت میں نہ ڈالیں جو وہ برداشت نہ کرسکتا ہو۔ اصل ضرورت افغانستان میں امن کی ہے باقی باتیں بعد کی ہیں۔ اگر امن ہوگا تو اسلامی عناصر منظم ہو کر اقتدار پر قبضہ بھی کرسکیں گے ورنہ بد امنی کی حالت میں ان کی حکومت قائم کردی گئی تو بھی فساد زدہ علاقے میں کوئی نظم قائم نہیں رکھا جاسکے گا۔ پھر جب مجاہدین میں اتحاد ہی نہیں ہوگا تو حکومت اگر انہیں دے بھی دی جائے تو وہ اسے چلا کیسے سکیں گے۔ جہاں تک اسلامی حکومت کا تعلق ہے' وہ تو ہم اب تک خود پاکستان میں قائم نہیں کرسکے نہ اس کے کوئی آثار ہیں چنانچہ افغانستان سے پہلے اسے پاکستان میں قائم کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ دنیا میں ہر جگہ غیر اسلامی مسلمان حکومتیں ہی چل رہی ہیں' افغانستان میں بھی ایسا ہو تو تعجب کیا ہے بلکہ یہ امر خوشی کا باعث ہونا چاہیے کہ ایک حکومت قائم تو ہوگئی جس کے تحت جان و مال کو تحفظ حاصل ہوگا اور لاکھوں مہاجرین دوبارہ اپنے گھروں میں آباد ہوسکیں گے اور مسلمان ایک دوسرے کا خون بہانے سے بچ سکیں گے۔

یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ افغانستان دار الفساد بن جاتا ہے تو یہ فساد افغانستان تک محدود نہیں رہے گا۔ اس کی لپیٹ میں صرف پاکستان نہیں آئے گا بلکہ وسط ایشیا کے نئے ابھرتے ہوئے مسلمان ممالک بھی آجائیں گے اور اس فساد کے سبب یہ نئے غنچے کھلنے سے پہلے ہی مرجھا کر برباد ہوجائیں گے۔

پختون قوم پرست حکمت یار کی حمایت کریں گے؟

پچھلے ہفتہ کابل حکومت کا ایک صدر تھا ایک حکومت تھی' ایک فوج تھی' ایک جھنڈا تھا اور ایک ترانہ تھا لیکن دوسرے ہفتہ میں ایسا انقلاب آیا کہ نہ کوئی صدر رہا نہ حکومت' فوج بھی منقسم ہوگئی اور کابل ریڈیو جو مجاہدین کو باغی اور دہشت گرد لٹیرے قرار دیتا تھا' یہ اپیلیں نشر کرتا رہا کہ عظیم مجاہد رہنما متفق اور متحد ہو کر آئیں' کابل کو سنبھال لیں لیکن اقوام متحدہ کے خصوصی ایلچی بینن سیوان نے اتفاق اور اتحاد کی جانب سے مایوسی کا اظہار کیا اور سیاسی مبصرین پیش گوئی کرنے لگے کہ ایک ملک کی حیثیت سے افغانستان کا وجود ختم ہوگیا ہے۔

ویسے بھی تیرہ سال سے یہ کوئی ملک نہیں تھا' ایک میدان جنگ تھا۔ اس جنگ میں کئی لاکھ افراد مارے گئے۔ کئی لاکھ معذور ہوگئے اور کئی لاکھ بے خانماں ہوگئے ہیں۔ افغان جہاد میں ابتدا ہی سے یہ کمزوری تھی کہ جہاد کی شرعی شرائط کو پورا نہیں کیا گیا۔ ان میں سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ جہاد ایک جماعت بن کر ایک امیر کے تحت لڑا جائے لیکن تیرہ سال سے جہاد افغانستان کی صورت یہ تھی کہ علیحدہ علیحدہ لشکر ترتیب دے دیئے گئے تھے جن میں بیرونی ملکوں سے اسلحہ اور رقم حاصل کرنے کے معاملے میں رقابت تھی تو نسلی' لسانی' فرقہ ورانہ اختلافات کے بت آستینوں میں تھے اور اقتدار ذاتی کی کشمکش بھی اس لڑائی میں شامل تھی۔ تیرہ سال کی سخت جان کاہ جدوجہد کے دوران کبھی ایک بار بھی سنجیدگی سے یہ کوشش نہیں کی گئی کہ اگر سب نہیں تو کم از کم طاقتور دھڑے ہی مل کر ایک ہوں تاکہ جب متبادل اقتدار اور نظام دینے کا وقت آئے تو یہ آسانی سے ممکن ہو اور اقتدار کے خلا میں خانہ جنگی ابھر کر نہ آئے' اگر اس بارے میں پہلے سے کچھ سوچا اور کیا جاتا تو جہاد افغانستان کے خاتمے پر افتراق انگیز مناظر نہ ہوتے۔

کابل میں ایک عبوری حکومت سب کی خواہش ہے لیکن اس کی نوعیت کے بارے میں اس قدر جھگڑے ہیں کہ اگر یہ عبوری حکومت قائم ہوگئی تو بھی ہر وقت ٹوٹنے کے خطرہ سے دوچار رہے گی اور یہ خدشہ برابر رہے گا کہ افغانستان تقسیم ہوگا اور خدا نہ کرے کہ یوگو سلاویہ کی طرح تقسیم ہو۔ بہتر یہ ہے کہ مجاہد رہنما غور کرلیں' اگر وہ اپنی صفوں میں پائیدار اتحاد نہیں پیدا کرسکتے اور مل جل کر رہنے کا قابل عمل فارمولا نہیں بنا سکتے تو بہتر یہی ہے کہ خیرو خوبی کے ساتھ الگ ہونے کا فارمولا بنا لیں اور کچھ بھی کریں مگر افغانستان کے شہروں اور قصبات کو اس نئی خون ریزی سے بچائیں جو مسلمانوں کے درمیان اخوت کے رشتوں کو ہمیشہ کے لئے کاٹ دے گی۔

افغانستان کی بنیاد تو اسی وقت ہل گئی تھی جب ظاہر شاہ کا تختہ الٹ دیا گیا کیونکہ افغانستان کو اس بادشاہت نے ہی ایک زنجیر میں باندھ رکھا تھا۔ یہ زنجیر ٹوٹ گئی اور کوئی نیا رشتہ اتحاد یا نیا نظام پیدا نہیں ہوا۔ ظاہر شاہ کی جگہ سردار داؤد نے لی لیکن نہ ان کا کوئی احترام تھا نہ ان کے پیچھے روایات کی طاقت تھی نہ وہ کسی طرح کی بصیرت رکھتے تھے۔ افغانستان میں ۱۹۷۸ء کا کمیونسٹ انقلاب اور ۱۹۷۹ء میں روس کا داخلہ بھی ایسا تھا کہ اس کے بعد افغانستان ایک ملک نہیں رہا' میدان جنگ بن گیا۔ اس جنگ میں کمیونسٹ اقتدار کی صورت بھی یہ تھی کہ آج ترہ کئی ہیں تو کل حفیظ اللہ امین ہیں۔ پھر ببرک کارمل ہیں اور آخر میں نجیب اللہ۔ ان میں ہر ایک کی آمد و رفت خونیں واقعات کے پس منظر میں ہوئی۔

اس طرح کی اندرونی کشمکش اور انقلاب در انقلاب کا شکار بر سر اقتدار گروہ ملک کو استحکام نہیں دے سکتا تھا' صرف روسی امداد کے بل بوتے پر وہ چل رہے تھے اور جب یہ امداد بند ہوگئی تو ان کا مستقبل بھی تاریک ہوگیا لیکن کابل کے برسراقتدار گروہ کے حال و مستقبل کی تاریکی سے افغانستان کے لئے کوئی نئی روشنی نہیں پھوٹی' نئے خطرات نمودار ہوئے ہیں' اگر افغان رہنما متحد ہوتے تو کابل کے در و دیوار سے ان پر پھول برسائے جاتے اور وہ شاندار طریقے پر اپنی حکومت تشکیل دیتے لیکن باہمی افتراق کا نتیجہ یہ ہوا کہ کابل کے اندر' کابل کے باہر اور کابل سے دور دور تک لشکروں کا۔ گھیراؤ نظر آتا ہے۔

ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جس کے قبضے میں جو علاقہ ہے وہ اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں

بڑے گروہوں سے قطع نظر چھوٹے گروہ بھی کئی ہیں اور گروہ چھوٹا ہو یا بڑا اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ یوں بھی سردار کی انا طاقتور ہوتی ہے ' وہ کسی کے آگے جھکنا نہیں جانتا اور جھک جاتا ہے تو بغاوت کرنے میں بھی اسے دیر نہیں لگتی۔ آج کا افغانستان اس طرح کے کئی قبائلی سرداروں کی سر زمین میں بٹا ہوا ہے ۔ ان میں کچھ ہیروئن سمگلنگ اور ہتھیاروں کی تجارت میں بھی مصروف ہیں تاہم سارے گروہ ہتھیار بند ہیں۔

جو بڑی تنظیمیں ہیں ان کا بھی حال یہ ہے کہ ان کے فوجی کمانڈر سمجھتے ہیں کہ اصل چیز تو ہم ہیں یہ پاکستان یا ایران یا دوسری جگہ پر بیٹھے لوگ ہمارے سامنے کوئی چیز نہیں ' انہیں ہمارے حکم پر چلنا ہوگا ' ہمارے مفادات کے مطابق طرز عمل اختیار کرنا ہوگا یہ کس قدر اندوہناک المیہ ہے کہ افغان مجاہد نہ صرف گروہوں میں بٹے رہے بلکہ ہر گروہ ٹکڑیوں میں بھی بٹ گیا اور اب ان کے درمیان پارٹی ڈسپلن یا جماعتی نظم و ضبط تلاش کرنے کی کوشش عبث ہے ۔ یہ ساری ٹکڑیاں من مانی کریں گی اور معلوم نہیں کیا انجام ہوگا' تاہم بڑے لیڈر متفق ہو کر کابل میں ایک عبوری حکومت چلاتے ہیں تو وہ حالات کو سنبھالا دے سکتے ہیں۔

خوش قسمتی سے افغان فوج ابھی باقی ہے اگرچہ اس میں بھی کافی ٹوٹ پھوٹ ہوگئی ہے پھر بھی فوج کا ادارہ اپنی اس ٹوٹی پھوٹی حالت میں بھی افغان سرزمین پر لا اینڈ آرڈر کو بحال کرسکتا ہے' بشرطیکہ رہنما حضرات اپنے جھگڑوں کو بذریعہ شمشیر طے کرنے کا خیال دل سے نکال دیں اور جو اختلافات ہیں وہ سیاسی طریقے پر حل کئے جائیں۔ یقیناً افغان سیاست کا یہ مسئلہ ہے کہ پختونوں کے ہاتھ میں ہمیشہ اقتدار رہا اور تاجک ازبک وغیرہ احساس محرومی کا شکار رہے اور اب اگر کہیں یہ خیال ابھر کر آیا ہے کہ بھاڑ میں جائے افغانستان ہم اپنے شمالی علاقہ میں غیر پختون ریاست قائم کریں گے اور اس کا تعلق وسط ایشیا سے جوڑ دیں گے تو یہ حیرت کی بات نہیں ہے۔

قوم پرست عناصر وہاں کافی عرصہ سے آزادی کے خواہاں تھے اور ادھر اگر پختون قوم پرست یہ سمجھتے ہیں کہ افغانستان کا غیر پختون علاقہ نکل گیا تو ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف کی پختون آبادی ایک نیا پختونستان بنا سکیگی ' تو یہ سوچ بھی باعث حیرت نہیں ہے کیونکہ پختون قوم پرستی کا ہمیشہ وجود رہا ہے اور اس کی سوچ بھی یہی رہی ہے ۔ بیگم نسیم ولی خاں اور اجمل خٹک نے تو فوراً کہہ بھی دیا ہے کہ ہم پختون قومیت کے لئے ضرورت ہوگی تو حکمت یار سے بھی ہاتھ ملائنگے ان سب قوم پرستوں کو یہ بھی خیال ہے کہ امریکہ برصغیر کی جدید تشکیل کرنے والا ہے ' اس میں تاجک دیش بنے گا تو پختونستان بھی ہوگا ' آزاد کشمیر ہی ہوگا ' سرائیکی علاقہ بھی ہوگا ' سندھی ' مہاجر اور بلوچ دیش بھی ہونگے ۔ یہ اگر بالکل الگ الگ نہیں

احمد شاہ مسعود کون ہیں؟

کمانڈر احمد شاہ مسعود نے بارہ سال پہلے روس کے خلاف جنگ میں عالمی شہرت حاصل کی ۔ وہ دوسرے مجاہد رہنماؤں کے برعکس افغانستان میں ہی رہے اور ان کا خاصے اہم علاقے پر کنٹرول رہا۔ کابل کے شمال مشرق میں مکمل طور پر ان کا قبضہ ہے۔

احمد شاہ مسعود بنیادی طور پر اسلامی تحریک کے آدمی ہیں۔ ظاہر شاہ کے دور اقتدار میں انہوں نے اس تحریک میں شمولیت اختیار کی ۔ گلبدین حکمت یار کے ساتھی بھی تھے۔ اپنی انجینئرنگ کی تعلیم وہ مکمل نہیں کرسکے۔ روس نے انہیں کابل حکومت کے وزیر دفاع کے عہدہ کی بھی پیش کش کی تھی جسے انہوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ اچانک ان کی طاقت میں اضافہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نجیب کے ہٹ جانے سے کابل میں اقتدار کا خلا پیدا ہوگیا تھا اور کابل فوج کے طاقتور دھڑوں نے جن میں غیر پختون جنرل بھی نمایاں ہیں' حالت خوفزدگی میں کمانڈر مسعود کی پناہ تلاش کی کیونکہ صرف وہی حکمت یار کی فوجوں کا کابل میں فاتحانہ داخلہ روکنے کے سلسلہ میں مددگار ہوسکتے تھے۔

کمانڈر مسعود سے برطانیہ اور فرانس نے ہمیشہ رابطہ رکھا لیکن امریکہ انہیں نظرانداز کرتا رہا اور اس نے پشاور میں مقیم افغان رہنماؤں کو ترجیح دی مگر اب امریکہ اور اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بطروس غالی نے بھی تسلیم کرلیا ہے کہ کمانڈر مسعود کو نظرانداز کرنا غلطی تھی اور وہ نئے رابطوں کے ذریعے اس غلطی کی تلافی کر رہے ہیں۔ کمانڈر مسعود جہاد کے اس عرصہ میں مستقلاً افغانستان میں رہے۔ وہ صرف ایک بار اکتوبر ۹۰ء میں دوسرے مجاہد رہنماؤں سے مصالحتی بات چیت کے لئے اسلام آباد آئے تھے ۔ کمانڈر مسعود کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک آزاد شخصیت ہیں' اپنی پالیسی اپنے ساتھیوں کے مشورہ سے بناتے ہیں' امریکہ' سعودی عرب' ایران اور پاکستان کسی کا آلہ کار نہیں ہیں اور نفاذ شریعت کے حامی ہیں لیکن اس معاملہ میں اپنے آپ کو اعتدال پسند بتاتے ہیں۔

کمانڈر مسعود کی فوجوں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ان میں کافی نظم و ضبط پایا جاتا ہے اور جو علاقہ ان کے زیر انتظام ہے' اس میں عوام کی سہولتوں کے لئے اچھے انتظامات کئے گئے ہیں جس سے عوام خوش ہیں اور پنج شیر وادی کے لوگ کمانڈر مسعود کو پنج شیر کا شیر کہتے ہیں۔ وہ تاجک ہیں اور افغانستان کی تاریخ میں تاجک پختون کشمکش کی جڑیں کافی گہری ہیں۔ ایک تاجک بچہ سقہ نے کابل کا تخت الٹ دیا تھا لیکن وہ چند دن سے زیادہ حکمران نہیں رہ سکا۔ اس کے بعد پختون افواج نے تاجک علاقہ میں کافی قتل عام کیا مگر تاجک آج بھی بچہ سقہ کو ہیرو کے طور پر یاد کرتے ہیں تاہم مسعود تاجک قوم پرستوں سے بالکل الگ اور مختلف ہیں۔ وہ اسلامی نعرے بلند کرتے رہے ہیں اور انہوں نے جو نئی حکمران کونسل تشکیل دی ہے' اس کا نام بھی "اسلامی جہاد کونسل" رکھا ہے۔

مسعود اور حکمت یار کا جھگڑا بھی بہت پرانا ہے اور اس زمانے سے چلا آرہا ہے جب وہ طلبا تحریک میں تھے اور ان کے درمیان اختلافات پیدا ہوگئے۔ مسعود پنج وقتہ نمازی ہیں اور روزانہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ کمانڈر مسعود زمرد کی تجارت بھی کرتے ہیں۔ پیرس میں ان کی قیمتی پتھروں کی دکانیں ہیں اور کہا جاتا ہے کہ مسعود کے بھائی نے حال ہی میں کئی کروڑ مالیت کے قیمتی پتھروں کا سودا ایک مغربی فرم سے کیا ہے۔ کمانڈر مسعود کا ایک بھائی پروفیسر برہان الدین کا داماد بھی ہے ۔ پروفیسر برہان الدین ربانی جمیعت اسلامی کے سربراہ ہیں۔ وہ تاجک ہیں اور کابل یونیورسٹی میں دینیات کے استاد تھے۔ ان کے کمانڈروں میں وادی پنج شیر کے سید احمد شاہ مسعود کے علاوہ ایک اور کمانڈر اسماعیل خان بھی ہیں جو ہرات کے علاقہ میں موثر ہیں۔ کمانڈر احمد شاہ مسعود بظاہر تو برہان الدین کی جماعت کے نظم میں ہیں اور ان کے گوریلا افغانستان کے سب سے زیادہ نظم و ضبط کے پابند مجاہد ہیں لیکن وہ پروفیسر برہان الدین ربانی سے بڑی طاقت ہیں بلکہ اصل طاقت وہ خود ہی ہیں ۔ ان کا امریکہ اور ایران سے بھی رابطہ ہے۔

ہونگے تو ان کی کنفیڈریشن ہوجائیگی اس لسانی قوم پرستی سے قطع نظر ایک اور منحوس چیز جس نے افغانستان پر سایہ کر رکھا ہے وہ فرقہ پرستی ہے اور اس شیعہ سنی جھگڑے کو ایران کے وجود نے نئی طاقت بخشی ہے ۔ پھر بنیاد پرست اور غیر بنیاد پرست کے عنوان سے تقسیم الگ ہے اور تفرقہ کے ان طاقتور عناصر کے مقابلے میں اتحاد کے لئے حالات بھی ناساز گار ہیں اور اتحاد کی خواہش بھی کمزور ہے۔

مجاہدین کے ساتھ سنی گروہ ہیں جن کا مرکز پشاور ہے جبکہ افغان شیعہ گرہوں کا ایک اتحاد ایران میں کام کررہا ہے ۔ جناب حکمت یار کی حزب اسلامی سنی گروپ میں طاقتور ہے ' اس کو آپ پختون گروپ بھی کہہ سکتے ہیں ' ان کا دائرہ اثر پاکستان سے متصلہ علاقے ہیں ۔ ان پر الزام یہ ہے کہ انہوں نے روسیوں کے خلاف تو کم جہاد کیا ' زیاد لڑائی مجاہدین کے دوسرے گروپوں سے کرتے رہے ہیں ۔ پہلے جناب یونس خالص ان کے ساتھ تھے ' بعد میں وہ اختلافات کی وجہ سے الگ ہوگئے اور علیحدہ گروپ تشکیل دیا۔ ان کا اثر مشرقی علاقے خصوصا جلال آباد اور اس کے اطراف میں ہے ۔ اس گروپ کے ایک بہترین کمانڈر عبدالحق ہیں ' وہ آج کل کابل کے اطراف میں ہیں۔

پروفیسر رسول سیاف نے اپنے مجاہد گروہ کی بنیاد ۱۹۸۳ء میں رکھی ' انہیں سعودی عرب سے کافی مدد ملتی رہی ہے مگر افغانستان کے اندر ان کا کوئی خاص کردار نہیں ہے ۔ سیاسف خالص اور حکمت یار تینوں کی شیعہ گروپوں سے ان بن بھی ہے ان تینوں کو بنیاد پرست کہا جاتا ہے ۔ ایک محاذ اسلامی ہے جو اعتدال پسند ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ۔ اس کا اثر قندھار میں ہے ۔ پیر سید احمد گیلانی اس کے رہنما ہیں اور ان کے ظاہر شاہ سے قریبی روابط ہیں ۔ ایک اور جماعت حرکت انقلاب اسلامی ہے ' بنی محمدی اس کے سربراہ ہیں جو فقہ کے استاد رہے ہیں ۔ انہیں جنوبی افغانستان میں ظاہر شاہ کے حامی قبائل کی کچھ حمایت حاصل ہے ' جبہ نجات ملی کے نام سے ایک تنظیم ہے یہ اعلانیہ ظاہر شاہ کی حمایت اور وفاداری کا دم بھرتی ہے ' اس کے رہنما پیر صبغت اللہ مجددی ہیں وہ پہلے کوپن ہیگن کی جامع مسجد کے امام بھی تھے ۔

شیعہ جماعتوں کا ایک اتحاد حزب وحدت کے نام سے ہے ۔ ایک اور شیعہ افغان تنظیم حرکت اسلامی کا مرکز پشاور ہے ۔ اس کے رہنما شیخ آصف محسنی ہیں ۔ شیعہ جماعتوں کا دعویٰ ہے کہ وہ افغانستان میں پچیس فی صد ہیں اس لئے انہیں اس تناسب سے حکومت میں نمائندگی ملنی چاہیے جبکہ سنی تنظیموں کا بیان ہے کہ افغانستان میں شیعہ دس فی صد سے زیادہ نہیں اور ان میں ہزارہ قبائل بھی شامل ہیں جو اسماعیلی ہیں۔

افغانستان میں تاجک شمالی علاقہ میں آباد ہیں' فارسی بولتے ہیں اور زیادہ تر سنی ہیں ۔ پہلے افغانستان کی آبادی میں پختونوں کی تعداد ساٹھ فی صد بتائی جاتی تھی ' اب تاجک دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی تعداد کم ہوگئی ہے کیونکہ بہت سے پختون پاکستان اور کئی دوسرے ملکوں میں چلے گئے اور مستقل وہیں آباد ہوگئے ہیں تاہم پختونوں کی اکثریت ہے اور اسی لئے حکمت یار انتخابات کے حامی ہیں کیونکہ انتخابی عمل میں انہیں اکثریت حاصل ہوگی۔

انتخابات میں پختون اکثریت کے خوف کے ازالہ کے لئے بعض شیعہ رہنماؤں نے متناسب نمائندگی کی بنیاد پر انتخابات کی تجویز پیش کی ہے جس سے تمام لسانی اور فرقہ وارانہ اقلیتوں کو اطمینان ہوگا کہ انہیں نمائندگی حاصل ہو جائے گی لیکن انتخابات کا مرحلہ تو دور کی بات ہے' پہلے امن و امان کی فضا در کار ہے اور فضا پیدا کرنا آسان نہیں جبکہ افغان مسلح گروپوں کے درمیان تصادم کا نہ صرف خطرہ ہے بلکہ جگہ جگہ سے تصادم کی خبریں ملتی رہی ہیں۔

ایک افسوس ناک بات یہ ہے کہ روسی افواج کے انخلا کو تین سال گزر گئے۔ ان تین سالوں میں یہ دیکھ کر بھی کہ نجیب کا چل چلاؤ ہے ' افغان مجاہدین نے آپس میں نہ اتفاق پیدا کیا نہ افغانستان کے لئے اقتدار کے کسی فارمولے پر متفق ہوئے ۔ یہی وجہ تھی کہ روس کے جانے کے باوجود نجیب کی حکومت تین سال چل گئی۔ جلال آباد پر بھی مجاہدین کا حملہ اس لئے ناکام رہا کہ ان کی کوئی متحدہ کمان نہیں تھی۔ کابل میں کٹر کمیونسٹ جنرل شاہنواز تنائی کی بغاوت بھی اس لئے کامیاب نہیں ہوئی کہ انہوں نے پٹھان ہونے کی بنا پر بعض پٹھان مجاہد گروپوں کی امداد حاصل کر لی تھی اور انہی کی درپردہ امداد نے بغاوت کو ناکام بنایا۔

جنرل نجیب کے اقتدار کا آناً فاناً ختم ہونا حیرت انگیز نظر آتا ہے لیکن اس میں بڑا دخل اس بات کو ہے کہ وسط ایشیا کے ملکوں کی آزادی کے بعد تاجکوں میں نیا حوصلہ پیدا ہوا۔ کمانڈر مسعود کو تاجکستان میں ایک ہیرو سمجھا جاتا ہے اور سرحد پار سے حمایت ملنے پر تاجکوں کے حوصلے بلند ہوگئے اور انہیں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اگرچہ وہ ملک میں پچیس فی صد ہیں لیکن دوسرے اقلیتی گروہوں کو ملا کر ایک طاقت بن سکتے ہیں۔ اس نئی تاجک لہر کا نتیجہ یہ تھا کہ کابل کی فوج کے تاجک جنرل اور سپاہی کمانڈر مسعود سے مل گئے اور انہوں نے مزار شریف اور دوسرے اہم علاقہ پر قبضہ کرلیا اور روس سے رسد کی آمد کا راستہ بھی بند کر دیا لیکن کمانڈر مسعود تاجک قوم پرست نہیں ہیں' وہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ پٹھانوں کے ساتھ مل کر چلنا ہوگا اسی لئے وہ کابل میں داخل نہیں ہوئے تاکہ مصالحت ہو جائے تو سب مل کر داخل ہوں لیکن پٹھان رہنما نئی صورت حال پر حالت غیض و غضب میں رہے۔

حکمت یار ویسے بھی سخت گیر آدمی ہیں۔ انہوں نے روسی جنگی قیدیوں کی رہائی کے معاملے میں جنرل آصف نواز کو شرمندہ کرایا اور کسی کی بات نہیں مانی۔ خلیجی جنگ کے دوران صدام کے پر جوش حامی رہے اور حکومت پاکستان کے لئے مسئلہ پیدا کیا۔ اب بھی ان کے رویہ میں طاقت پر اعتماد پایا جاتا ہے لیکن افغانستان کے حالات کی بہتری کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ اسلامی تحریک کے دو بڑے رہنما حکمت یار اور مسعود آپس میں مفاہمت کریں۔ اس مفاہمت سے ایک مشترکہ حکومت بنے اور چلے جس میں دوسرے شریک ہوں اور سیاسی معاملہ کا سیاسی طریقہ پر تصفیہ ہو۔ اگر یہ نہیں ہوگا اور فیصلہ ہتھیاروں سے کرنے کی کوشش ہوگی تو یہ ہتھیار اپنا ہی گلا کاٹیں گے کیونکہ وہ تو دوست دشمن کی پہچان نہیں رکھتے۔ ○○

تازہ ترین

☆

مجاہدین کے دستے فاتحانہ کابل میں داخل ہوچکے ہیں اور اگرچہ یہ تعین نہیں ہوسکا کہ کس کا پلہ بھاری ہے تاہم احمد شاہ مسعود اور گلبدین حکمت یار کے مابین جھڑپیں شروع ہوچکی ہیں۔ احمد شاہ مسعود کا یہ بیان بڑا ہی معنی خیز ہے کہ حکمت یار نے نجیب حکومت کے ساتھ مل کر "کودی تا" کیا ہے۔!

یہ بھی ایک "عید ملن پارٹی" تھی لیکن....

اس کا مقصد "یاد دہانی" تھا

نجیب صدیقی

عید کے بعد عموماً عید ملن محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ عید کا دن ایک بندہ مومن کے لئے اظہار تشکر کا دن ہے۔ سیاسی لوگ تو اس دن کو بھی اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور مجمع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے الزام اور جوابی الزام میں الجھے رہتے ہیں۔ انہیں اس بات سے غرض بھی کیا کہ عید کی حقیقی خوشی کیا ہے اور کیوں ہے؟

تنظیم اسلامی نے بھی عید ملن کا پروگرام بنایا لیکن اس کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ مقصود ان لوگوں کو جمع کرنا تھا جنہوں نے رمضان المبارک میں تنظیم اور انجمن کے زیر اہتمام اپنی راتیں قرآن مجید کے ساتھ گزاری تھیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں اخبارات میں اشتہار کے ذریعہ جس بات کی منادی کی گئی وہ یہ تھی کہ صیام و قیام کی برکات کو دائمی اور مستقل بنانے یعنی روزہ رکھنے کے بعد قرآن کا ترجمہ سن کر روح میں جو بالیدگی پیدا ہوئی ہے' آیئے دیکھیں اس کو کس طرح برقرار رکھا جاسکتا اور مزید ترقی دی جا سکتی ہے۔ امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس ضمن پر شرمین ہال بندر روڈ میں بعد نماز مغرب خطاب فرمایا اور کہا کہ عمل صالح اللہ ہی کی طرف اوپر چڑھتا ہے۔ پھر قرآن مجید کی آیات کے حوالے سے اس کی آپ نے تشریح فرمائی۔

لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ایک موسم بہار آیا اور چلا گیا بلکہ شعوری طور پر کوشش کرنی چاہئے کہ اس بہار کے ثمرات کو دائمی بنایا جائے۔ روزہ کا پہلا مقصد تقوی ہے دوسرا مقصد شکر ہے' تیسرا مقصد رشد ہے یعنی فوز و فلاح۔ تقوی روح سعی و عمل کا نام ہے۔ اس کا پہلا زینہ اسلام ہے' دوسرا ایمان اور تیسرا احسان ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کا علم اور شے ہے اور معرفت اور شے ہے۔ قرآن مجید کی ہدایت منکشف نہیں ہوتی جب تک پڑھنے سننے والے کا باطن پاک نہ ہو چکا ہو۔ قرآن مجید کے چار مقامات پر حضورؐ کا چار مرتبہ اس طور پر تذکرہ ہے کہ وہ آیات پڑھ کر سناتے ہیں' حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں۔ اگر تزکیہ نہیں ہو رہا تو کتاب معلومات کے درجے میں ہے۔ آپ نے اس کی قرآن مجید کی مختلف آیات کے حوالے سے بھرپور تشریح فرمائی۔

شکر کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ شکر فطرت کا رد عمل ہے۔ ایک صحت مند انسان کے دل میں اپنے محسن کے لئے قلب کی گہرائیوں سے شکر کے جذبات ابھرتے ہیں۔ جانوروں میں بھی یہ جذبہ کسی حد تک پایا جاتا ہے۔ آپ نے اس کی مثالیں دیں۔ پھر کہا کہ شکر کے تین درجے ہیں' شکر بالقلب' شکر باللسان اور شکر بالجوارح۔ ان تینوں کی تفصیلاً تشریح بھی فرمائی۔ رشد یعنی فوزو فلاح کسے کہتے ہیں' اس کو حاصل کرنی کے لئے شعوری جدوجہد کس سمت میں ہونی چاہئے' اسے بھی پوری طرح واضح کیا۔

آپ نے اپنی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دعوت رجوع الی القرآن ہی ہے جس نے بہت سی زندگیوں میں انقلاب برپا کیا ہے۔ یہی قرآن رشد و ہدایت کا سرچشمہ بھی ہے اور آنحضورؐ کا آلہ انقلاب بھی۔ آئندہ بھی اسی کے ذریعے سے انقلاب برپا ہوسکتا ہے جس کو ہم جہاد بالقرآن کا عنوان دیتے ہیں اس سے نفوس کا تزکیہ ہوگا کیونکہ یہی دلوں کے روگ کے لئے شفاء ہے۔

شرمین ہال کی کرسیاں بھر چکی تھیں۔ تنظیم اسلامی کے رکن مزید کرسیاں لاکر بچھا رہے تھے۔ امیر تنظیم نے جگہ کی تنگی کو دیکھتے ہوئے فرمایا کہ کچھ لوگ اسٹیج پر آجائیں تاکہ کھڑے ہونے والے زحمت سے بچ جائیں۔ خواتین کے لئے مخصوص جگہ بھی پر ہوچکی تھی اور بہت سی خواتین کھڑی ہوکر تقریر سن رہی تھیں۔

"عید ملن" کا یہ انداز اس سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہمارے مقاصد کیا ہیں۔ جن لوگوں نے اس دنیا ہی کو اپنا مقصد بنایا ہوا ہے ان کے یہاں تو کھیل کود' ڈرامے' موسیقی اور دیگر خرافات ہی نظر آتی ہیں مگر جو لوگ اللہ کے دین کی سربلندی کا جذبہ رکھتے ہیں اور صیام و قیام نے جن کے دلوں میں تقوی پیدا کیا ہے' وہ شکر کا وہ انداز اختیار کرتے ہیں جس کو انہوں نے اپنے نبیؐ کے طرز عمل سے سیکھا ہے۔ یہ اجتماع ۹ر اپریل جمعرات بعد مغرب ہو رہا تھا۔

۱۰ر اپریل یعنی جمعہ کا خطاب بھی اس پروگرام کا دوسرا حصہ تھا۔ قرآن اکیڈمی کراچی میں ساڑھے گیارہ بجے آپ نے ان سوالوں کا جواب دیا۔ جن کا ذکر شرمین ہال کے خطاب کے آخری حصہ میں کیا تھا آج مسلمان پوری دنیا میں ذلیل و خوار کیوں ہیں؟۔ پورے دین پر عمل کیوں نہیں ہے' نیو ورلڈ آرڈر کیا ہے' فتنہ دجال کیا ہے؟۔

جمعہ کے اس خطاب میں بھی لوگ جس ذوق و شوق سے آئے وہ دیدنی تھا۔ نیچے کا پورا ہال بھر چکا تھا' گیلری اور پیچھے کے کمروں تک میں صفیں لگی تھیں جس سے اندازہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں پیاس ہے اور وہ اچھی اور معقول بات سننے کے طالب ہیں۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے' وہ تو بھر پور عزم کے بعد ہی ہوسکتا ہے کیونکہ معاشرے نے انہیں اس طرح سے جکڑ لیا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد بھی اس سے نکل نہیں سکتے۔ اس جکڑبندی سے نکلنے کا واحد ذریعہ وہ شعوری ایمان ہے جس کا ذکر امیر محترم بار بار کرتے ہیں۔ جب تک یہ ایمان پختہ نہیں ہوتا' معاشرے کی گرفت سے نکلنا بہت مشکل ہے۔ امیر محترم نے اس روگ کی نشاندہی اس طرح کی کہ دین کے اعتبار سے جب تک ہماری بے عملی' بد عملی اور دو عملی قائم رہے گی' ذلت و رسوائی مقدر بنی رہے گی۔

موجودہ حالات میں امت مسلمہ جس گرداب میں پھنس چکی ہے وہ کیا ہے اور اس سے نکلنے کی تدابیر کیا ہیں۔ اس مشکل کا حل کیا ہے؟۔ اس کا حل یہ ہے کہ قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ قرآن ہی منبع و سرچشمہ ہدایت ہے۔ اس سے ایمان علی وجہ البصیرت حاصل ہوگا۔

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

اپنا پیسہ سود سے پاک رکھئے

اس خباثت کی جڑ "محنت کے بغیر کمائی" ہے

ایک مغربی دانشور کی طرف سے اسلام کی حقانیت کا بھرپور اعتراف

اخذ و ترجمہ: سردار اعوان

جناب ایم۔ ایل۔ لمان (Mr. M.L. Lehmann) نے یہ مقالہ امریکی ریاست مشی گن کے مشہور شہر ڈیٹرائیٹ میں ۲۶ر تا ۲۸ر اکتوبر ۹۰ء جاری رہنے والی اہل علم کی ایک مجلس میں پڑھا جو امریکی مسلمان ماہرین سماجیات کی انجمن کا انیسواں سالانہ جلسہ تھا۔ ہمارے وطن میں ان دنوں سود کا مسئلہ زیر بحث ہے اور افسوس کہ پابند شریعت مسلمانوں کا معاشرہ ہونے کا دعویٰ رکھنے کے باوجود ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے واضح احکام کو متنازع بنانے پر تل گئے ہیں جبکہ بہت سے سلیم الفطرت غیر مسلم دانشور بھی ان کی حکمت کے قائل ہیں۔ مقالہ نگار کے بارے میں یہ تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ عیسائی ہوں گے تاہم ان کے نام کی ساخت اس گمان کی گنجائش بھی پیدا کرتی ہے کہ موصوف شاید یہودی ہوں جن کی سود خوری ضرب المثل ہے۔

زیر نظر مقالے کو اردو کا جامہ پہنانا کسی ایسے شخص کے لئے ہرگز آسان نہ تھا جو اقتصادیات اور مالیات کی مروجہ اصطلاحات کے فہم سے نابلد ہو چنانچہ ترجمے میں کوئی خامی محسوس کی جائے تو ہمارے قاری خود اپنی صلاحیت کو استعمال کر کے یہ کمی پوری کرلیں -- مدیر

مغربی بنکاری نظام نے زر افراط زدہ (Inflated Money) کی مدد سے جس طرح دنیا بھر کے وسائل پر قبضہ جما لیا ہے اس نے باشعور مغربی شہری کو بھی چوکنا کردیا ہے اور اب وہ اپنے مصنوعی بنک کھاتے (Bank inflated checking Account balance) سے پیچھا چھڑانے کی فکر میں ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ مسلمان سود کی آمیزش کے سبب اس نظام سے متنفر ہیں تو محسوس ہوا کہ محض چند لوگ نہیں بلکہ ایک بہت بڑا قافلہ گویا منزل کی تلاش میں ہے۔

میں آپ سب حضرات کو حلال اور حرام مال کے بارے میں یہ اہم فرق بتاتا چلوں کہ قرآن کی رو سے مال حرام میں افراط زدہ زر بھی شامل ہے لہٰذا ہمیں جائزہ لینا ہوگا کہ کس طرح اسے محدود کیا جائے جبکہ چیک کے استعمال کی سہولت بھی برقرار رہے۔ یہاں اگر کوئی قابل عمل بات سامنے لائی جاسکی تو اس کی عملی تفصیلات کی تیاری میں آپ کے ساتھ کام کر کے مجھے خوشی ہوگی کیونکہ انصاف پر مبنی رویہ جو آپ کی روایات میں شامل ہے' میرے لئے بھی بلا شبہ کشش کا باعث ہے۔

اس موضوع پر بات کرنے سے پہلے مروجہ مالی اصطلاحات پر ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ لگتا ہے اب تک کسب حلال کے بارے میں اتنا نہیں لکھا گیا جتنا حرام کی کمائی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ مجھے حلال کمائی کے لئے عربی کا صحیح الفاظ تو معلوم نہیں البتہ ایس۔ ایم یوسف نے اس کا یہ مفہوم تحریر کیا ہے " اسلام صرف محنت کو کمائی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اس کے بغیر کمائی کا کوئی تصور اسلام میں نہیں "۔ یہی حاصل میری اس گفتگو کا تھا جو "بین الاقوامی ادارہ فکر اسلامی " کے اراکین کے ساتھ ہوئی۔ خود مجھے بھی اسی نظریے سے اتفاق ہے کہ روپیہ محنت کا ہی نتیجہ ہونا چاہیے لہٰذا ہمیں حلال کمائی کی یہی تعریف قبول کر لینی چاہیے۔ اس کے لئے انگریزی کا کوئی ایک لفظ تلاش کرنا ضروری نہیں اور میرے خیال میں ایسا کوئی لفظ موجود بھی نہیں ہے۔ آپ کے یہاں پھر بھی حرام کمائی کے لئے لفظ ربا تو ہے۔ فضل الرحمٰن نے اس کا لغوی معنی زیادتی' بڑھوتری یا اضافہ تحریر کئے ہیں جبکہ معاشی اصطلاح میں اس سے مراد سود ہے۔

اب آیئے اصل بنیاد کی جانب۔ محنت کے بغیر کمائی سود ہے تو زر کے افراط کو آپ کیا کہیں گے؟۔ پورے معاشرہ کی قیمت پر ایک مخصوص طبقہ کو اس کے ذریعہ کمائی کرنے کی کھلی چھٹی سود سے بھی بد تر بات ہے جس میں محنت کا سرے سے کوئی حصہ نہیں۔ بلکہ افراط زدہ زر تو وہ بد ترین اور بلا محنت اصل زر ہے جو نہ صرف سود پر قرض دیا جاتا ہے بلکہ سود سے حاصل ہونیوالی رقم سے آگے بھی قرضوں کا نہ ختم ہونے والا چکر چل جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں افراط زر کے باعث اصل زر میں ہونے والی کمی کو پورا کرنے کے لئے سود لینے کا جواز پیدا کرلیا گیا ہے۔

"ربا" کو سود کے معنوں میں لینا اس لئے بھی اصل مفہوم سے کم تر ہے کہ قرآنم مجید کی دوسری سورۃ (یعنی بقرہ) کی آیت ۲۷۵ کی رو سے بلا کمائی بڑھوتری (Unearned Increase) کے الفاظ بہر حال ربا کا بہتر مفہوم ادا کرتے ہیں۔ تجارتی منافع جائز کمائی ہے اور مذکورہ بالا آیت میں "ربا" تجارت کے مقابلہ میں آیا ہے یعنی تجارت کے علاوہ جس میں اہم عنصر محنت کا ہے' ہر قسم کا اضافہ اور زر کا افراط یا سود سب ربا ہیں۔ نقد اموال کے علاوہ بھی دوسری کئی چیزیں محنت کا حاصل ہیں' ان میں سے مال و زر کو الگ سے کیا نام دیں۔ کسی بھی زبان میں اس کے لئے الفاظ تلاش کرنا خاصا مشکل ہوگا۔ میرے مطالعہ کی حد تک ماہرین معاشیات صرف سود کے ذریعے اصل زر میں اضافہ کو ہی سود کے معنوں میں لیتے ہیں گویا دوسری ساری چیزیں حلال ہیں بشمول افراط زدہ روپیہ کے۔ یہاں تک کہ فضل الرحمٰن صاحب

کا تجویز کردہ اسلامی بنک بھی افراط زر سے خالی نہیں ۔ وہ لکھتے ہیں کہ چونکہ بیشتر جمع شدہ رقوم بنک میں ہی رہیں گی لہٰذا اسلامی بنک جدید بنکوں کی طرح اس رقم کا خاصا بڑا حصہ کاروبار میں لگا کر منافع کما سکتا ہے ۔ حالانکہ اس طرح بنک یہ رقم جو دراصل اس کی ملکیت نہیں اور نہ ہی کسی محنت کے نتیجہ میں اسے حاصل ہوئی ' دو دفعہ شمار کررہا ہوگا ۔ انہوں نے یہ "قیمتی" مشورہ بھی دیا کہ مغربی بینکنگ کے خراب پہلو چھوڑ کر صرف اچھے پہلو اختیار کر لئے جائیں مگر کسی نظام کے صرف "اچھے پہلو" اختیار کرنا ہی تو اصل مسئلہ ہے ۔ اکثر مغربی اور مسلم ماہرین معاشیات کی طرح ان کے لئے بھی قیمتوں میں مصنوعی اضافہ پریشانی کا باعث ہے لیکن روپیہ کا مصنوعی اضافہ جو اس کا اصل سبب ہے ' کسی کو نظر نہیں آتا کیونکہ سبھی یہ سمجھتے ہیں کہ روپیہ "پھیلانے" کا حکومت کو حق حاصل ہے جبکہ در حقیقت ایسا نہیں۔ مشہور ماہر معاشیات ای ۔ سی رائیگل (E.C Rigel) کا کہنا ہے کہ صرف وہی حکومت نئے نوٹ جاری کرسکتی ہے جو اتنی مالیت کی اشیاء مارکیٹ میں لانے کی ذمہ داری بھی لے ۔ اس کے برعکس ٹیکسوں وغیرہ سے روپیہ جمع کر کے کام چلانا ہرگز قابل ستائش نہیں ۔ مجھے اس نظریہ سے اتفاق ہے کیونکہ اس طرح روپیہ کا محنت سے بہرحال تعلق قائم رہتا ہے باوجود یکہ روپیہ پہلے سے گردش میں آجاتا ہے ۔

آج کے دور میں حلال مال کا تصور واضح کرنے کا لئے ضروری ہے کہ حرام یعنی بغیر محنت حاصل ہونے والے مال کے نقصانات کا جائزہ لیا جائے ۔ سود اور افراط زر سے دراصل روپیہ کی قدر کا پیمانہ ہی بدل دیا جاتا ہے جبکہ سورۂ نمبر ۸۳ کی پہلی تین آیات میں خبردار کیا گیا ہے کہ لینے اور دینے کا پیمانہ ایک ہی رکھا جائے ۔ روپیہ جو اصلاً ایک قدر کی اکائی ہے ' اسی صورت میں اشیاء اور خدمت کی قدر کا پیمانہ رہ سکتا ہے جب وہ صرف محنت کا حاصل ہو ۔ پھر چونکہ روپیہ ہر ایک کو استعمال کرنا ہے اس لئے اسے حقیقی قدر کا پیمانہ بنائے رکھنا انصاف کا تقاضا ہے ۔ یہی اس کا صحیح استعمال ہے اور اسی کو قرآن حلال اور حرام سے تعبیر کرتا ہے ۔ موجودہ بینکنگ کے خلاف ایک واضح طریقہ کار سامنے لایا جائے اور اس پر محنت سے کام کیا جائے تو جارج واشنگٹن کے الفاظ میں کوئی وجہ نہیں کہ عقل اور دیانت سے کام لے کر کسی بھی مسئلہ کا حل تلاش نہ کیا جاسکے"۔

تاریخی لحاظ سے اگرچہ روپیہ کی حیثیت قدر کی ایک طبعی اکائی کی رہی ہے مگر عملاً اس کا استعمال "کیلو گرام" جیسی شے سے مختلف نہیں تاہم پلاٹینم اور ریڈیم سے بنا ہوا کیلو گرام نیشنل بیورو آف اسٹینڈرڈز میں محفوظ ہے جبکہ "روپیہ" یوں محفوظ نہیں ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ نقدی چونکہ ہر شخص کثرت سے استعمال کرتا ہے لہٰذا لوگ ڈالر جیسی کاغذی کرنسی کو بھی حقیقی شے خیال کرنے لگے ہیں لیکن گز خواہ بطور پیمانہ کتنا ہی استعمال ہو ' لوگ اسے حقیقی شے نہیں مانیں گے حالانکہ میگنا کارٹا کے دنوں میں جب "ہمارے لارڈ بادشاہ" کا لوہے کا گز تھا ' گز کو گز ہی سمجھا جاتا تھا ۔ لوگوں میں رائج روپیہ کے بارے میں ایک حقیقی شے کا غلط تصور "بغیر محنت کمائی" کے جاری رہنے میں فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے ' رائیگل نے آج سے چالیس سال قبل اس تصور کی نفی کی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوسکا اور آج بھی بنک کرنسی کو حقیقی یعنی بذات خود قیمتی اور نایاب شے شمار کیا جاتا ہے ۔

دانائی اور حکمت ہر دور کی مشترکہ متاع ہے ۔ سود اور افراط زر کی دوہری لعنت لین دین کے پیمانے کو "مستقل ادائیگی" کی شے قرار دئے جانے کا نتیجہ ہے ۔ ہمارے بزرگ وقفہ وقفہ سے حقیقی شے دے کر اپنا ادھار بے باق کرلیا کرتے تھے۔ یہ ایک موزوں طریقہ تھا اور ہمیں اسی پر عمل کرنا چاہیے "ادھار" کو "مستقل ادائیگی" (Permanent Payment) کے طور پر استعمال کرنے کو اسی صورت میں روکا جاسکتا ہے کہ ایک مخصوص وقفہ کے بعد بالفعل ادھار بے باق کردیا جائے جیساکہ چار صدی قبل تک تجارتی معمول تھا۔ جبکہ آج کل تاجروں کے بجائے بنک ایک دوسرے کے ساتھ ادھار بے باق کرتے ہیں ۔ وہ فیڈرل ریزرو بنک میں محفوظ رقوم ہی ایک دوسرے کے کھاتے میں منتقل کرلیتے ہیں اور کسی ایک مدت میں کچھ بنکوں سے جتنے ڈالر نکلتے ہیں اتنے ہی ڈالر بعض دوسرے بنکوں میں آجاتے ہیں ۔ پھر چونکہ یہ ایک متواتر عمل ہے لہٰذا محفوظ رقوم پر افراط طلب کرنا ممکن نہیں رہتا۔

بنک میں آپ کا کھاتہ کبھی بے باق نہیں ہوتا اس لئے کہ افراط کے تازہ پیمانے کی نشاندہی نہیں ہوپاتی ۔ بنک میں ایسی فالتو رقوم ہر وقت موجود رہتی ہے جو آپ کے اخراجات سے بچ رہتی ہے ۔ بنک یہ رقم سود پر دے دیتا ہے حالانکہ یہ رقم آپ کے کھاتہ میں بھی درج رہتی ہے ۔ ہوتا یہ ہے کہ نیا روپیہ گردش میں ڈال دیا جاتا ہے اور وہ بھی صارفین کی بجائے قرض دینے والوں کی جانب سے۔ اس سود خوری کا علاج یہ ہے کہ تمام کھاتہ دار ایک معین وقفہ کے بعد اپنے کھاتے بے باق کرا لیا کریں جس طرح ایک بنک دوسرے بنکوں کے ساتھ بے باق کرتا ہے پھر وہ اپنی رقم سے جائداد وغیرہ خرید لیں تو اس طرح روپیہ روک کر نہ رکھنے کے اسلامی حکم پر بھی عمل درآمد ہوگا ۔ مگر اس کے لئے امداد باہمی کی طرز پر گروپ تشکیل دینا ہوں گے ۔ یہ گروپ آپس میں ادائیگی کا طریقہ طے کرلیں جو سونے کی شکل میں ' سود سے پاک کسی ادارہ کے حصص کی صورت میں یا دوسری کوئی شے ہوسکتی ہے ۔

فرض کیجئے آپ ایک ہاؤسنگ کو آپریٹو کے حصص خرید کر اس کے ممبر بن جاتے ہیں تو اس ادارہ کے دوسرے اراکین کے ساتھ لین دین کا اہتمام کرلیں ۔ اور ایک دوسرے کو براہ راست دینے کی بجائے ادائیگی کے چیک کلیرنگ سروس کی معروفت بھجوائیں ۔ وہ آپ کو آپ کے بقایا جات سے بھی مطلع رکھیں گے۔ کلیرنگ کے لئے ایک خاص مدت مثلاً ہر تین ماہ بعد تاکہ حصص کا منافع بھی موصول ہوجائے ' مقرر کی جاسکتی ہے ۔ اس موقعہ پر جس حصہ دار کے پاس فالتو آمدن ہو وہ کسی دوسرے سے جسے خسارہ ہوا ہو ' اتنی رقم کے حصص خرید سکتا ہے تاکہ کل خسارہ اور زائد آمدن وہیں آپس میں برابر ہوجائے اور بنک سے سوائے حساب کتاب رکھنے کے رجوع کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے ۔یعنی گذشتہ تصفیہ کے بعد جب کلیرنگ سروس سارے چیک ایک ہی دفعہ بنک کو ارسال کرے گی تو اسی وقت بنک میں ایک طرف آنے والی رقم دوسری طرف خرچ ہوجائیگی ۔ خاص کر اس صورت میں کہ "فرستندہ" (Payer) اور یا بندہ (Payee) ایک ہی بنک میں اکاؤنٹ رکھتے ہوں ۔ یہ طریقہ چل نکلے تو عام ضرورت کی اشیاء فراہم کرنے والے اداروں بلکہ ٹیکس کے چیک بھی مخصوص وقفوں سے اکٹھے بھجوائے جاسکتے ہیں ۔

مشہور کہاوت ہے کہ اس دنیا میں کوئی بات نئی نہیں ہوتی ' باقاعدگی سے ادھار واپس کرنا بھی

کوئی نئی بات نہیں ۔ اکثر لوگ اس جانب مائل ہورہے ہیں جیسے کاشتکار کیمیاوی کی جگہ دوبارہ نامیاتی کھاد کا استعمال شروع کررہے ہیں ۔ جدید "ترقی دادہ" بنکاری اور کاشتکاری کا نظام شکست و ریخت سے دوچار ہے۔ پہلے زمانہ میں کاروباری ادائیگیاں اس وجہ سے ایک عرصہ ملتوی رہتی تھیں کہ موقعہ پر سونے چاندی سے حساب بے باق کرنا مشکل تھا لیکن اس عرصہ کے لئے دی گئی ہنڈی یا دوسرا کوئی کھاتہ ادھار ہی تصور ہوتا تھا، کوئی شخص اسے بطور "ادائیگی" قبول کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی وہ روپیہ کہلاتا تھا حالانکہ اس میں اور آج کے چیک میں استعمال کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ اسے سونا یا چاندی دے کے بے باق کیا جاتا تھا اگرچہ اس میں کچھ وقفہ ضرور آتا تھا۔ مثال کے طور پر پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں تجارتی ادھار جو "ہنڈی" (bill of exchange) کہلاتے، گردش کرتے ہوئے چین اور نو دریافت ملک امریکہ تک پہنچ جاتے تھے مگر شمالی اٹلی میں لگنے والے تجارتی میلہ کے موقع پر سب ادھر کھینچے چلے آتے اور وہاں کے بہت بڑے کلیرنگ ہاؤس میں جمع ہوجاتے جہاں ان کے لئے بدلہ میں سونے اور چاندی کے سکے وصول کر لئے جاتے تھے۔ یہ میلہ سال میں چار مرتبہ لگتا تھا۔

بعد میں مختلف قصبوں کو مستقلاً تجارتی میلوں کی حیثیت حاصل ہوگئی تو اس طرح کی ہنڈیاں اپنا تجارتی سفر (Circuit) پورا کرکے سال میں ایک دفعہ بے باق ہوجاتیں۔ اسی طرح شروع میں امریکی آباد کار ایک ہی دفعہ سال میں ایک دوسرے کے ساتھ حساب کتاب چکا لیتے تھے تاکہ سکوں کا استعمال کم ہو ۔ دو فرانسیسی باشندوں کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی ۔ ان کے خیال میں فرانس جیسے کسی ملک میں ان کے مقابلہ میں کہیں بڑی تعداد میں سکے درکار ہوتے ۔

روپیہ صرف اسی صورت میں مال تجارت کی قدر کے پیمانہ کے طور پر برقرار رہ سکتا ہے جب حساب بے باق کرنے کا یقینی اہتمام ہو ۔ جونہی اس سے پہلو تہی ہوگی، روپیہ "تجارت کھاتہ" کی بجائے ایک ایسی شے بن جائیگا جس پر سود وصول کیا جاسکے اور جو بطور پیمانہ یکساں نہ ہو ۔ کیا ہم اسے نہیں روک سکتے ؟۔ کاروباری ادھار عام طور پر بلا سود ہوتا ہے ۔ آپ کی جیب میں موجود ڈالر دراصل کاروباری ادھار ہے جس پر آپ سود نہیں لیتے بلکہ بہی کھاتہ کے اندراج کی طرح ان کی مالیت ادا یا وصول کرنے کی آپ کے پاس ایک مہلت ہے۔

تجارتی کھاتے کے مطابق حساب بے باق رکھنے کا ایک بڑا فائدہ خصوصاً آج مالیات کے ایک مرکزی نظام کے تحت ہونے کے سبب یہ ہوگا کہ فیڈرل ریزرو بنک چاہے ڈالر کا افراط صفر حد تک لے آئے یا اس کی قدر محفوظ رکھنے کی خاطر شرح سود آسمان تک پہنچا دے، آپ متاثر نہیں ہونگے کیونکہ آپ کا انحصار ان ڈالروں پر ہوگا ہی نہیں جو آپ کے کھاتہ سے باہر ہیں۔ آپ اور آپ کے ساتھی کوآپریٹو کے اراکین جب چاہیں حصص کو چھوڑ کر یا اضافی طور پر دوسرے کسی مال کے ذریعہ حساب بے باق کرنے پر اتفاق کرسکتے ہیں اور حالات کے تحت کلیرنس کا وقفہ بھی زیادہ کرسکتے ہیں۔

میں اب اپنی بات اس سوال پر ختم کررہا ہوں کہ فرض کریں جو ہم چاہتے ہیں وہی نظام رائج ہوجاتا ہے یعنی مرکزی بنک مالیاتی نظام کو افراط اور سود کی مدد سے چلانے کی بجائے ایک ایسا مرکب نظام اختیار کرلیتا ہے جس میں کاروباری اداروں کا جال پھیلا دیا جاتا ہو جو سابقہ دور کی طرح وقفے وقفے سے ادھار بے باق کرنے کا اہتمام کریں تاکہ کھلی منڈی کی طرز پر ایسا نظام وجود میں آئے جس میں کسی انسان کا دخل نہ ہو بلکہ یہ نظام اپنی اصلاح خود کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو کیا ہم اس کا خیرمقدم کریں گے ؟۔ میرے نزدیک ایک آزاد اور سادہ نظام ہی جو ضرورت کے مطابق از خود اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، قانون قدرت سے مطابقت رکھتا ہے ۔ یہ سوال اس لئے بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ اگر ہم چاہیں تو موجود معاشی نظام سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے، خواہ یہ کتنا ہی وسعت اختیار کرچکا ہے۔ ○○

امتحانات سے فارغ طلبہ کے لئے

اسلامک جنرل نالج ورکشاپ

۹ر مئی ۹۲ء تا ۱۱ر جون ۹۲ء — قرآن کالج لاہور

میں منعقد ہوگی (ان شاء اللہ) جس میں مندرجہ ذیل مضامین کی تدریس ہوگی:

۱۔ نماز و قراءت قرآن کی تصحیح ۲۔ سیرت النبیؐ و مطالعہ دینی لٹریچر

۳۔ قرآن حکیم کے منتخب اسباق ۴۔ تاریخ اسلام

۵۔ ارکان اسلام اور ان سے متعلق تفصیلات

○ اس کورس میں رجسٹریشن کی آخری تاریخ ۷ر مئی ۹۲ء ہے۔

○ اوقات تعلیم صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے دوپہر تک ہونگے۔

○ کورس فیس مبلغ ۲۰۰ر روپے ہے، جس میں جملہ کتب کی قیمت شامل ہے۔

○ ہاسٹل میں رہائش کی محدود گنجائش ہے۔

○ ہاسٹل میں قیام و طعام کا اضافی خرچ ۵۰۰ روپے ہے۔

○ مستحق طلباء کے لئے رعایت کی گنجائش ہے۔

○ تدریس کا آغاز ان شاء اللہ ۹ر مئی سے ہوجائے گا۔

المعلن : ناظم قرآن کالج لاہور ۔ ۱۹۱ر اے، اتاترک بلاک ۔ نیوگارڈن ٹاؤن لاہور۔

فون: ۸۳۳۶۳۷ ۔ ۸۳۳۶۳۸ زیر اہتمام : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

سالانہ اجتماع

کے ایک "مبصر" کا تبصرہ

جناب محترم ڈاکٹر صاحب امیر تنظیم اسلامی

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ۔

خیریت دارم و خواہم۔

گذشتہ جمعرات ۱۶ اپریل کو لاہور آنا ہوا۔ مصروفیات و مشغولیات کچھ دینی تھیں اور کچھ دنیاوی۔ اسی روز رات (یعنی شب جمعہ) کو "مینار پاکستان" پر دعوت اسلامی کا تبلیغی اجتماع "اٹینڈ" کیا اور دوسرے روز ۱۷ر اپریل بروز جمعہ جامعہ منہاج القرآن کا پہلا "کانووکیشن" یاجلسہ دستار فضیلت منعقد ہوا جس میں شرکت مطلوب تھی۔ اگرچہ پروگرام میں تنظیم اسلامی کے ہیڈ آفس میں حاضری بھی شامل تھی (مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ جامعہ کے قریب ہی واقع ہے) لیکن جامعہ جاتے ہوئے راستے میں کہیں، میرے ساتھی نے آپ کے سہ روزہ اجتماع کا پوسٹر پڑھ لیا اور مجھے بتایا جس پر مجھے خوشی ہوئی کہ چلئے "چکنی چپڑی بھی اور دو بھی"۔

بعد نماز عصر ہم کانووکیشن سے فراغت حاصل کرچکے تھے۔ ہمارا پروگرام قیام لاہور کا اگرچہ دو دن کا تھا لیکن تنظیم اسلامی کے اجتماع میں شرکت کی غرض سے ایک دن کا مزید بڑھا دیا اور نشستیں جو پہلے سے ۱۷ر اپریل کی شام کو عوام ایکسپریس کے لئے بک کرائی گئیں تھیں، واپس کر کے ۱۸ر اپریل کی شام کو عوام ایکسپریس کے لئے بک کرالیں۔ لیکن جب ہم تنظیم اسلامی کے ساتھیوں سے ملے تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کا خطاب اب ۱۸ر اپریل بعد از نماز مغرب ہوگا، اس سے پہلے نہیں تو ہمیں افسوس ہوا کیونکہ ۱۸ر اپریل شام سوا چھ بجے ہماری گاڑی نے روانہ ہونا تھا ظاہر ہے کہ ہم خطاب میں شریک نہیں ہوسکتے تھے۔ بہر حال نماز مغرب آپ کی رہائش گاہ کے برابر والی مسجد میں ادا کی اور قرآن کالج میں پڑھنے والے بی۔ اے کے ایک طالب علم کی رہنمائی میں قرآن اکیڈمی (یا قرآن آڈیٹوریم) پہنچے۔

وہاں استقبالیہ پر پتہ چلا کہ اوپر اجلاس ہو رہا ہے اور وہاں ہماری شرکت کے "پاس" کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ ہم سے پوچھا گیا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ ہم نے انہیں بتایا کہ اگرچہ ہماری ڈاکٹر صاحب سے قلبی عقیدت تو ہے تاہم معروف معنوں میں ہم تنظیم کے رفقاء میں سے نہیں ہیں اور اجتماع میں شرکت مطلوب ہے، عام آدمی کی حیثیت ہی سہی تو انہوں نے ہمیں "مبصر کارڈ" ایشو کردیا۔ ہم ہال میں پہنچے تنظیم کی سالانہ کارکردگی کا جائزہ لیا جارہا تھا۔ "جائزہ" کے اختتام پر آپ کا مختصر تبصرہ سورۂ کہف کی آیت کے حوالے سے سنا تو ہم نے کہا چلیے " مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے مصداق اگر ڈاکٹر صاحب کا مفصل خطاب نہ سن سکے تو یہ تبصرہ ہی سہی۔ کیونکہ ہم خود کو اتنا اہم نہیں سمجھتے کہ ہماری خاطر پہلے سے طے شدہ پروگرام میں ردو بدل کرنیکی درخواست پیش کی جاتی (یعنی ڈاکٹر صاحب محض ہماری خاطر مکمل اور مفصل خطاب کرتے)۔

دوسری صبح نماز فجر بھی اسی مسجد میں ادا کی

مدرسہ و جامع مسجد نورانی سبزی منڈی خانپور ضلع رحیم یار خان کے استاذ حافظ محمد رمضان کا مکتوب جو انہوں نے امیر تنظیم اسلامی پاکستان کے نام ۲۰ر اپریل کو روانہ کیا، من و عن شائع کرنے میں ہمارے پیش نظر مصلحت یہ بھی ہے کہ اس کی روشنی میں تنظیم کے رفقاء اولا ان باتوں کی قدر و قیمت اور افادیت کو بہتر طور پر سمجھنے لگیں گے جو اسی سالانہ اجتماع کے موقع پر امیر محترم نے دین کا کام کرنے والے دوسرے گروہوں کے بارے میں کہیں جن میں "دعوت اسلامی" کے اثرات علامہ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کی تحریک کے نئے موڑ کا ذکر خاص طور پر آیا تھا۔ ثانیا وہ ابلاغ میں حکمت اور موقع کی مناسبت کا خیال رکھنے کی ضرورت کے بھی پہلے سے زیادہ قائل ہوجائیں گے جو ہمیشہ داعی کے پیش نظر رہنی چاہیے، ورنہ حافظ صاحب تو شاید اپنے خط کا جواب بذریعہ ڈاک وصول فرما کر بھی مطمئن ہو جاتے۔

فاضل مکتوب نگار کی نظر سے اگر "ندائے خلافت" گزرتا رہا تو آئندہ ایک دو اشاعتوں میں وہ اس تقریر کو بھی ان شاء اللہ پڑھ لیں گے جس میں امیر تنظیم نے اپنے رفقاء کے سامنے معاصر مذہبی جماعتوں کے کام کا مختصر جائزہ لیا۔ ان میں سے کسی کو بھی انہوں نے اپنا مد مقابل قرار نہیں دیا تھا۔ ان چند سطور میں اس مفصل گفتگو کا احاطہ ممکن نہیں لہٰذا حافظ صاحب سے درخواست ہے کہ ذرا انتظار فرمالیں اور اس تقریر کے مطالعہ کے بعد ہی کوئی حتمی رائے قائم کریں جسے ٹیپ سے اتارنے کا کام شروع کیا جاچکا ہے۔ فی الحال وہ ہماری اس اصولی گزارش پر غور فرمائیں کہ تنظیم اسلامی کے رفقاء کے جس انداز گفتگو پر انہیں صدمہ پہنچا اور دھچکا لگا، ہوسکتا ہے کہ اس میں "جارحیت" کا کچھ عنصر بھی پایا گیا ہو تاہم یہ سوچ بنیادی طور پر غلط نہ تھی۔ دیکھیے، ایک معاملہ تو اس شخص کا ہے جو متعدد مذہبی و دینی جماعتوں سے بیک وقت متاثر ہو اور سب سے ہمدردی اور دور کی صاحب سلامت کا رشتہ استوار رکھتا ہو۔ اس کے نزدیک یہ سب گروہ یکساں قابل ستائش ہوں گے لیکن ایک دوسرے شخص کا رویہ یقیناً ذرا مختلف ہوگا جس نے بر بنائے بصیرت ان میں سے کسی ایک کو جانچ پرکھ کر دوسروں پر ترجیح دی ہو اور صرف ترجیح ہی نہ دی ہو بلکہ دل و جان سے (بلکہ جیب کے ساتھ بھی) اس میں شمولیت بھی اختیار کر رکھی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل اس کے اس ایقان کا مظہر ہے کہ وہ گروہ جس کا وہ خود حصہ بنا ہے، دین کا کام زیادہ بہتر انداز میں کررہا ہے۔ البتہ اس سے دوسروں پر "کیچڑ اچھالنا" لازم نہیں آتا اور الحمد للہ کہ تنظیم اسلامی کے رفقاء اس حرکت سے پورے اہتمام کے ساتھ اجتناب برتتے ہیں۔ حافظ صاحب! آپ خود ہی انصاف فرمائیے کہ ہمارے رفقاء کی جن باتوں کا آپ نے ذکر فرمایا ہے ان میں کیچڑ اچھالنے کی کسی حرکت کی نشاندہی ہوتی ہے؟۔ انداز بیاں گرچہ بہت خوب نہیں تھا لیکن چاہتے تو وہ صرف یہی تھے نا کہ رجال دین (اور آپ کی شخصیت سے متاثر ہو کر انہوں نے آپ کو بجا طور پر انہی میں شمار کیا ہوگا) ان کے اس اطمینان میں اضافہ فرمائیں کہ جو کام وہ کررہے ہیں، دین ہی کی نسبتاً ایک بہتر خدمت ہے --- مدیر

اور پندرہ منٹ کے لئے نماز سے قبل سورۂ حدید کا مختصر تعارف جو آپ نے پیش کیا' اسے سن کر بہت مسرت ہوئی اور ہماری حاضری کا مقصد بھی کسی حد تک پورا ہوگیا۔ رات کا کھانا اور صبح کا ناشتہ بھی وہیں کیا۔ قرآن اکیڈمی سے کچھ تصانیف خرید کیں اور واپسی کے لئے عازم سفر ہوئے۔ جب ہم واپس آرہے تھے تو تنظیم اسلامی کے ایک رفیق نے ہم سے، یہ وعدہ لیا کہ ہم اپنے "تاثرات" ضرور لکھیں۔ بس اسی ایفاء عہد کے لئے یہ سطور تحریر کررہا ہوں۔

محترم ڈاکٹر صاحب! آپ کے بارے میں بہت اچھے جذبات و احساسات رکھتا ہوں اور یہی احساسات تھے جو مجھے آپ کے اجتماع میں لے گئے اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض کروں کہ تقریباً دوسال تک میں ماہنامہ "میثاق" کا مستقل خریدار رہا ہوں اس لئے کہ میری نظر میں آپ موجودہ دور میں احسن طریق سے قرآنی فکر لوگوں میں پیدا کررہے ہیں (اللّٰھم زد فزد) یہ الگ بات کہ آپ کے چند ایسے بیانات یا تحریریں پڑھ کر جو پیپلز پارٹی کی حمایت اور تائید میں جاتی تھیں مجھے بہت افسوس ہوا کہ آپ ایسا اہل علم ایک لادین نظریہ کی حامل جماعت کی سپورٹ کرے' شعوری یا لاشعوری طور پر اسے فائدہ پہنچائے تو یہ بات میرے احساسات کو (جو آپ کے لئے تھے) مجروح کرگئی لیکن اس کے باوجود دینی تعلق جو آپ کے ساتھ پیدا ہوچکا تھا' ختم نہ ہوسکا کما قال الشاعر۔

گو میں رہا رہین ستم ہائے "گوناں گوں"
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

(روز گار اس لئے نہیں لکھ رہا کہ حدیث میں ہے (لاتسبوا الدھر و انا الدھر) اسی تعلق کو لے کر آپ کے اجتماع میں حاضری دی۔ لیکن ایک چیز کو دیکھ کر کبیدہ خاطر ہوا۔ (صاف گوئی کے لئے پیشگی معذرت۔)

میری عمر (جو تقریباً چہل سال ہونے کو ہے) دینی مزاج رکھنے والے لوگوں ہی میں بسر ہوئی ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہر مکتب فکر کا آدمی صرف اپنی کاوشوں اور جدوجہد کو (جو وہ دین کے لئے کررہا ہے) اہمیت دیتا ہے اور دوسروں کی خدمات سے یکسر صرف نظر کرلیتا ہے بلکہ اس کی نظر میں دوسرے کی خدمات قطعاً ناقابل التفات اور محض خدمات بطن و دہن کہلانے کی مستحق ہیں۔ دوسرے مکاتب فکر کے متعلقین حضرات سے مل کر تو میں نے یہی تاثر لیا تھا۔ تاہم آپ کے بارے میں میں نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی ایسی بات ہوگی۔ لیکن میرا حسن ظن اس وقت پاش پاش ہوگیا جب آپ کی جماعت کے رفقاء کو بھی اسی مرض میں مبتلا پایا۔ مثلاً جب ہم مسجد مذکورہ میں پہنچے تو میں استنجا کے لئے بیت الخلا کی طرف چلا گیا جبکہ میرا ساتھی مسجد میں بیٹھ گیا مسجد میں موجود رفقاء میں سے ایک رفیق کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ جامعہ منہاج القرآن کے کانووکیشن میں شرکت کرکے آرہے ہیں تو وہ رفیق میرے ساتھی کا ہاتھ پکڑے مسجد کے اندرونی ہال میں لے کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ مقصد میرے ساتھی کی "برین واشنگ" تھی اور انداز ایسا تھا جیسے کسی غیر مسلم کو مسلمان بنانا مقصود ہوتا ہے۔

وہی "ہم چوما دیگرے نیست" والا انداز کہن اور دوسروں کی تحقیر دبے لفظوں میں۔ بہت صدمہ پہنچا دوسرا دھچکا اس وقت لگا جب واپسی پر ایک رفیق یہ کہنے لگا کہ آپ "کانووکیشن" میں آئے تھے' ہمارے ہاں بھی آئے ہیں اس دوران میں جو تاثر آپ نے لیا ہو وہ ضرور لکھیں۔ یعنی افسوس اس بات کا ہوا کہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ماشاء اللہ طاہر القادری صاحب بھی دین کا کام کررہے ہیں اور ڈاکٹر صاحب بھی دینی کام کررہے ہیں اور منزل تو سب کی ایک ہے' کام تو سب کا ایک ہی ہے ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں وغیرہ نہیں' بلکہ کہا تو یہ کہ آپ باہر کے آدمی ہیں اور باہر کا آدمی کمزوریوں اور خامیوں کو اچھی طرح اکاؤنٹ کرسکتا ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں وہ ہماری اجتماع میں حاضری کو یہ رنگ دے رہا تھا کہ گویا ہم ڈاکٹر صاحب کا اور ان کی جماعت کی کمزوریوں کو پکڑنے اور ان پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے لئے آئے تھے۔

محترم ڈاکٹر صاحب! کس قدر تنگ ذہنی ہے یہ۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر نیا آدمی کمزوری اور خامیوں کو پکڑنے کے لئے آئے۔ کیا مجھ ایسا آدمی جو فروعی تشخصات کو امت کے لئے سم قاتل گردانتا ہو' خالی الذہن ہو کر اور سیکھنے اور کچھ حاصل کرنے کے لئے نہیں آسکتا؟۔ تو بندہ نواز! یہ ہے ہم لوگوں کا "ذہنی سکوپ" انا اللہ و انا الیہ راجعون! میں نہیں سمجھتا کہ اس طرز عمل میں آپ کی تربیت کا کوئی خاص دخل ہے۔ تاہم یہ بھی امر واقعہ ہے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" یعنی آپ کی شخصیت پر آپ کے رفقاء کا یہ طرز عمل اثر ضرور ڈال سکتا ہے۔ میں نے اگرچہ اس مکتب فکر میں آنکھ کھولی اور اٹھان لی کہ جسے "بریلوی مکتب فکر" کہا جاتا ہے تاہم بلوغی شعور کو پہنچنے پر میں نے اپنا ذہن " ھو سما کم المسلمین" (القرآن) کے تحت افراط و تفریط اور فرقہ واریت سے ہٹا کر صرف اور صرف "مسلمان" کہلانے پر قناعت کرلی ہے۔ اسی وجہ سے میں تمام مکاتب فکر کے سنجیدہ علما کی تقریر اور تحریر سننے اور پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہوں اور یہی باعث تھا میری اجتماع میں حاضری کا۔

میرا یہ انداز فکر میرے ماحول کے لوگوں کو نہ بھایا اور میں تنہا ہوگیا جس پر مجھے کوئی تاسف نہیں مگر افسوس یہ ہوا کہ آپ کے ماحول میں بھی میں نے خود کو تنہا "پایا" گویا۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں "بیگانے" بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!!

محترمی! میں تنقیدی نقطہ نظر سے نہیں کہہ رہا بلکہ ایک تو چونکہ وعدہ کرچکا تھا سو ایفا عہد مقصود ہے دوسرے "الدین النصیحۃ" (حدیث) کے تحت یہ مقصد بھی ہے کہ رفقاء میں ابھی اصلاح کی گنجائش ہے سو آپ اس طرف توجہ دیں۔ پھر یہ خط "خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے" کا آئینہ دار بھی ہے کہ مجھ ایسے سیدھے سادے بندے جو ماحول کی گھٹن سے گھبراتے ہوئے تھے اور صاف ماحول میں سانس لینا چاہتے تھے' ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں اور شاید کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ انہیں ایسا ماحول مہیا کیا جائے کہ جہاں مثبت انداز میں دین کا کام ہوتا ہو اور جہاں دوسروں پر کیچڑ اچھالنے کی بجائے صرف اپنے کام سے مطلب رکھا جائے امید ہے میری اس صاف گوئی اور خیر خواہی کو سنجیدگی سے لیں گے۔

دعاگو

دستخط (محمد رمضان)

ندائے خلافت میں محترم ظفر انجم مسیحی صاحب کے دو خطوط شائع ہوئے۔ میں ادارہ اور جریدہ کی طرف سے اس کا جواب لکھ رہا ہوں' شائع فرما دیں۔ ڈاکٹر محمد آصف صاحب قریشی کا جواب بھی لکھنا چاہتا تھا مگر محمد نسیم الدین صاحب کے مضمون کے ساتھ اس کا سلسلہ ختم ہوجاتا

اپنے مہربان دوست جناب ظفر انجم مسیحی کے خط کے جواب میں ایک بزرگ قاری کا نامہ پچھلی اشاعت میں شامل ہوا جس کی شان "جلالی" تھی ۔ اس بار ایک اور محترم قاری کا گرامی نامہ پڑھیے جو "جمال" کا کچھ زیادہ ہی مظہر ہے ۔ وہ "فولاد" تھے تو یہ "بریشم کی طرح نرم" ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔ ہمیں امید ہے کہ ظفر انجم صاحب دونوں کی تہ میں پہنچنے کی کوشش کریں گے اور نعمت ہدایت تو بہر حال اللہ کی دین ہے' وہ جسے چاہے اور جب چاہے عطا فرما دے --- مدیر

محترم عزیز ظفر انجم صاحب!

آپ کی دو تحریریں "ندائے خلافت" میں پڑھ کر اللہ کا شکر اس بات پر ادا کیا کہ دنیا میں صحیح مسیحی بھی موجود ہیں ۔ کوئی زمانہ تھا جب ہم اس وقت کے آپ جیسے مسیحیوں کو مسلمان کہہ سکتے تھے کیونکہ اللہ کا دین اسلام ہی ہے اور تمام پیغمبران عظام نے اسلام ہی کی تبلیغ کی ۔ اختلاف تب پیدا ہوا جب آج کل کے ہم ایسے مسلمانوں کی طرح گذشتہ امتیں بھی اسلام کی صحیح تعلیم کو چھوڑ بیٹھیں ۔ پھر آپ نے قرآن مجید میں یہ بھی پڑھا ہوگا کہ مسلمانوں کے ساتھ دنیا میں اچھا سلوک کرنے والے حضرت مسیح کے پیرو کار ہونگے کیونکہ ان میں ایسے علمائے حق موجود ہیں جو احکام خدا وندی لوگوں کو سناتے ہیں اور خود بھی ان پر عمل کرتے ہیں ۔ میں سمجھتا ہوں آپ انہی علما میں سے ایک ہیں ۔ اگر مسیح کے پیرو کار واقعتاً پولوس کی بجائے حضرت مسیحؑ کی تعلیمات پر عمل کریں تو عیسائیت اور اسلام میں صرف اول اور آخر کا فرق رہ جائیگا یا طریقہ عبادت کا جس کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے کہ ہم نے تمام لوگوں کو علیحدہ علیحدہ طریقہ عبادت عطا کیا ۔ تو یہ فرق کوئی ایسا فرق نہیں ۔

محترم! میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اور آپ اپنی اپنی تعلیمات پر عمل پیرا ہوجائیں تو ہم پر اللہ کی برکتیں نازل ہونگی ۔ دنیا میں فی الحقیقت دو قسم کے لوگ ہی ہیں ۔ پہلا گروہ خدا پرست ' خدا ترس اور خدا کے فرمانبردار بندوں کا ہے جن میں باہم لڑائی نہیں ہوتی۔ حضرت عمرؓ جب بیت المقدس تشریف لے گئے تھے تو آپ نے وہاں ان کا طرز عمل پڑھا ہوگا ۔ قرآن حکیم خود حضرت مسیحؑ کا حدر درجہ احترام کرتا ہے اور ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ ہم انبیا میں تفریق نہ کریں۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اپنی شرارتوں اور خبث باطن سے ایسے لوگوں کو آپس میں لڑاتا ہے ۔ جھوٹی روایات کی بنا پر انبیا پر ناجائز حملے کرتا ہے جس کا شکوہ ہمیں اس لئے نہیں کہ یہود کے گمراہ لوگ تو انبیا کو قتل کرتے رہے ہیں ۔ ان گمراہ یہود کے پیرو کار آج بھی موجود ہیں جو انبیا کی تعلیم کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں ۔

آپ نے لکھا کہ مشنریاں مفت لٹریچر دیتی ہیں جبکہ مسلمان ایسا نہیں کرتے ۔ محترم! ہمارے گھروں کو ' ہمارے ملکوں ' ہمارے شہروں کو ڈیڑھ سو سال تک مغربی اقوام لوٹتی رہی ہیں ۔ آپ یقین کریں کہ لندن کی چالیس چالیس منزلہ عمارتیں اور پیرس کی شیشے کی طرح چمکتی سڑکیں سب ان مشرقی اقوام (جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے) کی دولت سے بنی ہوئی ہیں ۔ ہم ان کے مقابلہ میں اس قدر غریب ہیں کہ اگر آج امریکہ دو ہزار کمبل غریبوں کو بانٹنے کے لئے بھیجے تو ان میں سے ایک ہزار وہی لوگ آپس میں بانٹ لیں گے جن کے ذمے تقسیم کا کام لگایا گیا ہوگا ۔ ہالینڈ والے اگر تحصیلداروں یا پولیس کی معرفت ایک لاکھ ڈبی گھی کا بھیجیں تو وہ کسی غریب کو نہیں ملے گا بلکہ اس سے تحصیلدار اور تھانیدار کے گھر پکوان پکیں گے ۔ چور ایک رات میں گھر کا صفایا کرجاتا ہے' یہ ملک تو ڈیڑھ سو سال لٹتے رہے ہیں اس لئے ان کا سب سے بڑا مسئلہ اب بھوک بن گیا ہے ورنہ مسلمانوں میں مخیر لوگوں کی کمی نہیں ۔ ۱۸۵۷ کے بعد انگریزوں نے ۷۵۰ اوقاف ایسے ضبط کر لئے تھے جن سے درسگاہوں کے سارے اخراجات ' طلبا کی خوراک ' لباس 'کتب کا خرچ اور اساتذہ کی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ وہ اوقاف ضبط کر کے مشنریوں کو دے دئے گئے اور ملک کی آزادی کے بعد انگریزوں سے زیادہ بڑے لٹیروں سے قوم کو پالا پڑا۔

بہر حال آپ جیسے حقیقت پسند ' حقیقت کے متلاشی اور نیک سیرت لوگ مبارک کے مستحق ہیں جو دوسروں کا بھلا چاہتے ہیں ۔

فقط آپ کا مخلص   بشیر احمد

دار الشفاء ابن سینا ۔ شیخوپورہ

شمالی امریکہ میں تنظیم اسلامی کی شاخ کا قیام

الحمدُ لِلّٰہِ کہ

فوٹِپ (FOTIP)

یعنی فرینڈز آف تنظیم اسلامی پاکستان کے نام سے شمالی امریکہ میں

تنظیم اسلامی کا ایک حلقہ وجود میں آگیا ہے

جو غلبۂ اقامتِ دین کی جدوجہد میں تنظیم اسلامی پاکستان کی ممکنہ معاونت کے لیے کوشاں رہے گا

اس حلقے کے ناظم کے طور پر جناب عطاء الرحمٰن صاحب کا تقرر عمل میں آیا ہے

فوٹپ کے مرکزی دفتر کا پتہ حسب ذیل ہے:

Mr. Mohammad Ata-ur-Rehman

69 S, Nicoll Way, Glen Ellyn, Il 60137-6226 U.S.A

Telephone (Res): 708- 790-9205 (Fax)-(Tel. off): 312-814-4442

سالانہ اجتماع کے مقاصد کا ایک لفظی عنوان... تذکیر

تنظیم اسلامی کا سترہواں سنگ میل

ہمارے لئے صرف "احساس فرض" کو مہمیز کا کام کرنا چاہیے

لاہور میں منعقد ہونے والے سترہویں سالانہ اجتماع کی مختصر روداد

میاں اعجاز احمد

مارچ ۱۹۷۵ء میں عزم سفر کرنے والا ایک چھوٹا سا قافلہ جو کل ۶۳ افراد پر مشتمل تھا، اپنے سترھویں سالانہ اجتماع کے انعقاد کے ساتھ ہی اب اپنے سفر کے اٹھارھویں برس میں داخل ہوچکا ہے۔ ان سترہ برسوں میں کیا نہ گزری ہے قطرے پہ گہر ہونے تک---- اس کا صحیح اندازہ توان قدموں کو ہوسکتا ہے جنہوں نے ان گزرے دنوں میں منزل کی طرف سترہ سنگ ہائے میل طے کرتے ہوئے سنگ و خار کے بوسے لئے ہیں۔ ریگ زاروں کی تپش سے آبلہ پائی کا انعام پانے والوں کا کبھی کبھی نسیم سحر نے بھی استقبال تو کیا ہوگا لیکن انہیں کمر ہمت کو کھول کر ستانے کا اذن ابھی نہیں ملا کہ منزل دور بہت دور ہے۔ چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔

تاہم سالانہ اجتماع کے سایہ دار پڑاؤ ماضی و مستقبل میں جھانکنے کا موزوں مقام ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک موقع یہ سالانہ اجتماع پھر لایا ہے تو اول اول رب ذوالجلال کا صد شکر کہ جس نے ہمیں نہ صرف اپنی بندگی کا شعور بخشا بلکہ ان بندگان خدا کی ہم نشینی بھی عطا فرمائی جن کی رفاقت و قربت میں بندگی رب کا صحیح طریقہ بھی ملا اور سلیقہ بھی-- ہم سفروں کے لئے چشم و دل فرش راہ گو کہ ہیں وہ اس سے بے پراوہ۔ تاہم رسم دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے--- جی آیاں نوں، خوش آمدید!۔

گزشتہ سالانہ اجتماع کے بعد مجلس مشاورت کے پہلی سہ ماہی اجلاس میں ہی اس سالانہ اجتماع کے لئے طے کر لیا گیا تھا کہ بمقام لاہور ۱۷ر تا ۲۰ر اپریل ۹۲ء منعقد ہوگا۔ الحمد للہ کہ طے کردہ پروگرام کے عین مطابق یہ اجتماع منعقد ہو رہا ہے

۱۶ر اپریل کی شام کو ہی چند ساتھی لاہور پہنچ چکے تھے تاہم ۱۷ر اپریل کی صبح سے رفقاء جوق در جوق پہنچنا شروع ہوگئے۔ رہائش گاہیں اس بار بھی دو حصوں میں منقسم ہیں یعنی قرآن اکیڈمی ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن اور قرآن کالج ۱۹۱۔ اے، اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن ۔ ان دونوں مقامات کے مابین تقریبا ایک کلو میٹر کا فصل ہے۔ دونوں جگہ استقبالیہ قائم تھے۔ جہاں رفقاء کی رجسٹریشن کی جاتی رہی اور شناخت کے لئے ایک بیج ان کے سینے پر آویزاں کرکے ان کو ان کی الاٹ شدہ رہائش گاہ تک پہنچایا جاتا رہا۔

اجتماع کا غیر رسمی آغاز امیر محترم کے خطاب جمعہ المبارک سے ہوا۔ جامع القرآن کا ہال، صحن، مسجد کا بالائی ہال اور ملحقہ سڑکوں پر بچھائی گئی صفیں سامعین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ خواتین ہال بھی خواتین سے پر تھا۔

امیر محترم نے موجودہ صورت حال کے تناظر میں جب افغانستان اور مقبوضہ کشمیر میں جہاد کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، "جہاد فی سبیل اللہ" پر بھرپور روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ جہاد حریت بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کم نہیں لیکن ہر جہاد کو جہاد فی سبیل اللہ کہہ دینا ہرگز درست نہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ پر بھرپور روشنی ڈالی ۔ آپ نے فرمایاکہ اگرچہ جہاد حریت بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کم نہیں لیکن ہر جہاد کو جہاد فی سبیل اللہ کہہ دینا درست نہیں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تو دو شرائط کا پورا ہونا لازم ہے۔ اولا : دعوت کی سطح پر اتمام حجت، ثانیا ایک امیر کی قیادت ۔ اگر ان دنوں شرائط کا لحاظ نہ رکھا گیا ہوتو پھر اس کا یہی نتیجہ نکلے گا کہ عین فیصلے کے وقت ہر گروہ اور جماعت علیحدہ علیحدہ کھڑی ہوگی اور بارہا کے تجربات نے اب اس بات کو مبرہن کر دیا ہے لہٰذا ہمیں ان خالص دینی اصطلاحات کو گڈمڈ کرنے سے احتراز کرنا چاہئے کہ اس سے ان دینی تصورات کے اصل مفہوم اور روح کو ضعف پہنچتا ہے۔ آپ نے پاکستان کی موجودہ حالات پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا۔

اجتماع کے بقیہ پروگرام قرآن آڈیٹوریم میں ہونا طے پائے تھے۔ لہٰذا نماز عصر کے بعد یہاں پہلی نشست کا باقاعدہ آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ تلاوت کے بعد ناظم اعلی جناب ڈاکٹر عبدالخالق نے اپنے افتتاحی کلمات میں رفقاء کو خوش آمدید کہا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس اجتماع کے انعقاد کی ہمت بخشی اور اس میں شرکت کی توفیق بخشی ورنہ کئی ساتھی ایسے بھی ہوں گے جن کی خواہش رہی ہوگی کہ وہ بھی اس اجتماع میں شرکت کریں لیکن کسی ناگزیر مجبوری کے تحت وہ اس سے قاصر رہے۔ اس کے بعد ناظم اجتماع جناب میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد نے شرکاء کو ضروری انتظامی امور سے متعلق آگاہ کیا اور مختلف انتظامی شعبہ جات کے ناظمین کا تعارف کرایا۔

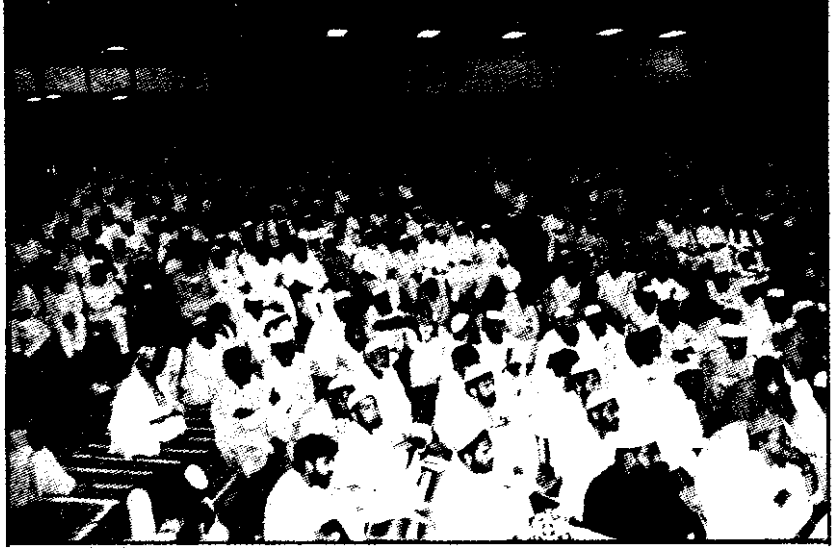

نماز مغرب کے بعد اسی روز کی آخری نشست میں ناظم اعلیٰ نے گزشتہ سال از فروری ۹۱ء تا فروری ۹۲ء کے دوران تنظیم کی سالانہ کار گزاری کی رپورٹ پیش کی۔ اس میں اس بار یہ جدت اختیار کی گئی تھی کہ پہلے سے رپورٹ کو طبع کروالیا گیا تھا اور اب یہ سامعین کے ہاتھوں میں تھی جو سننے کے ساتھ اسے پڑھتے بھی رہے جس کی وجہ سے توجہات مرکوز رہیں۔

سالانہ کارگزاری رپورٹ کے چیدہ چیدہ نکات یہ تھے

نظام العمل کی تنفیذ

نظام العمل حصہ اول کی تنفیذ پندرھویں سالانہ اجتماع کے بعد کی گئی تھی اور نظام العمل حصہ دوم کی تنفیذ گزشتہ سال سولھویں سالانہ اجتماع کے بعد عمل میں آئی۔ اب تمام رفقاء اس نظام العمل کے مطابق اپنے فرائض و معمولات پر کاربند ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور انہی کے مطابق ان کا احتساب بھی کیا جاتا ہے۔

تنظیمی جائزہ

چند ماہ قبل نظام العمل میں یہ ترمیم منظور کی گئی کہ مقامی تنظیم کے قیام کے لئے ملتزم رفقاء کی تعداد اب دس کی بجائے پانچ ہوگی۔ اس کے نتیجہ میں سال کے دوران چند تبدیلیاں وجود میں آئیں۔

اب سالانہ اجتماع کی موقع پر اندرون ملک چار حلقہ جات سرحد، شمالی پنجاب، پنجاب اور سندھ کے علاوہ پنجاب کے تین ذیلی حلقہ جات، شرقی پنجاب، غربی پنجاب اور جنوبی پنجاب قائم ہیں۔ ان کے علاوہ اندرون ملک اس وقت چودہ مقامی تنظیمیں کام کر رہی ہیں یعنی پشاور، راولپنڈی و اسلام آباد، گجرات، فیروزوالہ، لاہور شہر، لاہور شرقی نمبرا، لاہور شرقی نمبر۲ فیصل آباد، ملتان، کوئٹہ کراچی ضلع وسطی، کراچی ضلع شرقی نمبرا کراچی ضلع شرقی نمبر۲ اور کراچی ضلع شرقی نمبر۳۔

اس وقت اندرون ملک رفقاء کی کل تعداد سترہ سو اٹھتر ۱۷۷۸ ہے۔ دوران سال دو سو تنالیس ۲۴۳ رفقاء کا اضافہ ہوا اور دس رفقاء نے دوران سال تنظیم سے معذرت کرلی یا الگ کر دیئے گئے۔

توسیع دعوت اور رابطہ عوام

دوران سال پہلا علاقائی اجتماع چودہ تا سولہ اگست ۹۱ء کوئٹہ میں ہوا اور اس سے متصلاً قبل چودہ اگست کو جلسہ عام کا انعقاد کیا گیا۔ دوسرا علاقائی اجتماع دس تا تیرہ ستمبر ۹۱ء فیصل آباد میں طے تھا تاہم اس دوران اللہ تعالیٰ کی حکمت سے کچھ ایسی صورت حال پیدا ہوچکی تھی کہ تنظیم اسلامی نے اپنی جدوجہد کے دنیاوی ہدف کو "اسلامی انقلاب" کی بجائے "قیام خلافت" کا عنوان دینے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ فیصل آباد کے علاقائی اجتماع کے ساتھ جلسہ عام کو خلافت کنونشن کا نام دیا گیا اور اس کے بعد توسیع دعوت اور رابطہ عوام کے ضمن میں تمام پروگرام تحریک خلافت کی تحت کئے گئے۔

مشاورتی نظام

نظام العمل کی مطابق تنظیم اسلامی میں مشاورت کے لئے تین سطحیں معین ہیں:

۱۔ امیر تنظیم اور مرکزی شعبہ جات کے ناظمین پر مشتمل "مرکزی اسرہ"

۲۔ مرکزی مجلس عاملہ

۳۔ مرکزی مجلس مشاورت

ان سب کے اجلاس باقاعدگی سے پروگرام کے مطابق ہوتے رہے اور مشاورت کے صحیح تصورات اور منطقی تقاضے پورے کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ گزشتہ سالانہ اجتماع کے موقع پر مجلس مشاورت کا انتخاب عمل میں نہیں آیا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ چونکہ اس سال کے دوران نظام العمل کی تنفیذ کا بہت اہم مرحلہ درپیش ہے لہٰذا اس سلسلہ میں مسائل سے عہدہ براء ہونے کی خاطر سابقہ مجلس مشاورت کی مدت میں ایک سال کی توسیع کی جائے۔ چنانچہ اب اس سالانہ اجتماع سے قبل الحمدللہ نظام العمل کے مطابق آئندہ دو سال (۹۴۔ ۱۹۹۳ء) کی مدت کے لئے مجلس مشاورت کا انتخاب مکمل ہوچکا ہے اور اس اجتماع سے متصلاً قبل نئی مجلس مشاورت کا ایک مختصر اجلاس منعقد ہوچکا ہے۔

رفقاء کے وسیع تر حلقہ کی آراء سے استفادہ کی خاطر (توسیعی مشاورت) کا ایک اجلاس منعقد کرنا ضروری ہے۔ الحمد للہ اس کا بھی اہتمام ہوا جو اس سال ۳۰ر دسمبر ۹۱ء تا ۲ر جنوری ۹۲ء طے تھا تاہم اس میں زیادہ رفقاء نے دلچسپی نہیں لی اور اجتماع صرف ایک روز ہی جاری رہ سکا۔

تربیتی نظام

رفقاء کے مابین درجہ بندی اور ان کے لئے تربیتی و تنظیمی نصاب، نیز تربیت گاہوں کے انعقاد کا نظام الحمد للہ اب کافی مستحکم ہوگیا ہے۔ طے یہ ہوا تھا کہ مرکز میں ہر ماہ باری باری ایک ہفت روزہ مبتدی اور ایک ملتزم تربیت گاہ منعقد کی جائے۔ اس طے شدہ پروگرام کی نہ صرف پوری پابندی کی گئی بلکہ سندھ کے رفقاء کے مطالبہ پر کراچی میں دو اضافی ہفتہ وار مبتدی تربیت گاہوں کا بھی انتظام کیا گیا۔ اس طرح دوران سال سات مبتدی اور چھ ملتزم تربیت گاہیں منعقد ہوئیں جن سے مجموعی طور پر ایک صد سینتیس (۱۳۷) ملتزم رفقاء اور ایک صد تیرہ (۱۱۳) مبتدی رفقاء نے استفادہ کیا۔ اس سالانہ اجتماع سے متصلاً قبل اور متصلاً بعد مبتدی اور ملتزم تربیت گاہوں کا جو اہتمام کیا گیا ہے وہ اس پر مستزاد ہے۔ نظام العمل کے مطابق مبتدی اور ملتزم رفقاء کی ہفتہ وار اور ماہوار رپورٹس کا نظام بھی پوری طرح جاری ہے۔

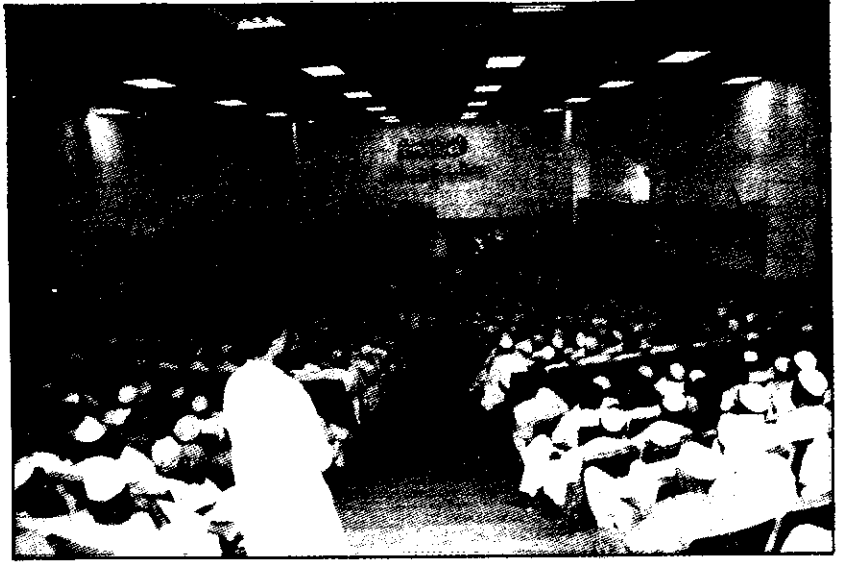

مقامی شعبوں اور مرکز میں رابطہ

حلقہ جات ' مقامی تنظیموں اور منفرد رفقاء کے لئے مرکز سے رابطہ کے ضمن میں قواعد و ضوابط متعین ہیں اور ان کے مطابق دوران سال عمل در آمد باقاعدگی سے جاری رہا۔ حلقہ جات اور مقامی تنظیموں کی جانب سے مقررہ فارم پر ماہوار رپورٹس مرکز اور دفتر حلقہ جات میں ضابطہ کے مطابق موصول ہوتی رہی ہیں اگرچہ بعض امراء کی جانب سے تساہل بھی ہوا تاہم مرکز میں اس کی جانچ پڑتال اور یاد دہانی کے موثر انتظام کی وجہ سے اس میں بھی تعطل پیدا نہیں ہوا۔ ان رپورٹس پر تبصرہ اور مناسب ہدایات بھی دی جاتی رہیں مبتدی اور ملتزم رفقاء کی ہفتہ وار اور ماہوار رپورٹس مرکز میں موصول ہوتی ہیں اور ان رپورٹس کی ایک نقل مقامی امیر کو بھی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں رابطہ اور رہنمائی اصلا مقامی سطح پر ہونی چاہئے لیکن فی الحال اس کا موثر انتظام نہیں ہوسکا اور یہ کام مرکز ہی سے بذریعہ خط و کتابت ہو رہا ہے۔ تقریبا پچاسی (۸۵) فیصد ملتزم رفقاء رپورٹس کی پابندی کر رہے ہیں لیکن منفرد اور اکثر مبتدی رفقاء کی کیفیت ابھی توجہ طلب ہے۔

امیر تنظیم کے دعوتی پروگرام

توسیع کے تقاضوں کے تحت یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ امیر محترم کے خطابات جمعہ کا سلسلہ اب صرف مسجد دارالسلام لاہور تک محدود نہیں رہنا چاہئے چنانچہ گزشتہ سال کے کے آغاز ہی میں طے کر لیا گیا تھا کہ ہر ماہ کا پہلا خطاب جمعہ مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور ' دوسرا قرآن اکیڈمی کراچی اور مہینہ کا آخری جمعہ جامع القرآن قرآن اکیڈمی لاہور میں ہوگا۔ اس کی پابندی کی حتی الوسع کوشش کی گئی تاہم تحریک خلافت کے سلسلے میں امیر محترم کے اندرون ملک دعوتی پروگراموں اور جلسہ ہائے عام ' نیز بیرون ملک اسفار کی بنا پر قرآن اکیڈمی لاہور میں خطابات جمعہ کا سلسلہ انتہائی محدود رہا البتہ مسجد دارالسلام لاہور اور قرآن اکیڈمی کراچی میں یہ خطابات پروگرام کے مطابق ہوئے۔

امیر محترم کا سلسلہ وار درس قرآن

یہ ہر ہفتہ کی شام کو جامع القرآن قرآن اکیڈمی میں منعقد ہوتا تھا۔ الحمد للہ یہ سلسلہ نومبر ۹۱ء میں اختتام پذیر ہوا۔ اس طرح اللہ تعالی کی تائید و نصرت سے مطالعہ قرآن حکیم کا یہ سلسلہ جو جون ۱۹۶۸ء سے مسجد خضراء سمن آباد لاہور سے شروع ہوا تھا' قریبا تیئس برس میں مکمل ہوا۔ اس کی بعد اس کے دور ثانی کا آغاز قرآن آڈیٹوریم میں کیا گیا اور اس کے لئے ہفتہ میں دو دن ہفتہ اور اتوار متعین ہوئے۔ الحمد للہ اس کی پابندی رہی اور سورہ البقرہ کے سات رکوع کا مطالعہ مکمل کر لیا گیا۔ رمضان المبارک سے قبل یہ سلسلہ عارضی طور پر منقطع ہوا اور اب تجویز یہ ہے کہ اس سلسلہ کو دوبارہ شروع کرتے ہوئے اولا مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب نمبر ا کے دروس ' جن کا دورانیہ ایک ایک گھنٹہ ہو ریکارڈ کئے جائیں تاکہ ہماری یہ اہم تنظیمی ضرورت بھی پوری ہو جائے۔ امیر محترم کے بیرون ملک اسفار کے ضمن میں بتایا گیا کہ اس سال وہ ملائشیا اور ابو ظبی کے مختصر دوروں پر ہی تشریف لے جاسکے۔

رپورٹ بیرون ملک

بیرون ملک مقیم تنظیم اسلامی کے رفقاء کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

ا۔ مشرق وسطی اور میں مقیم رفقاء

۲۔ برطانیہ ' فرانس اور امریکہ میں مقیم رفقاء

مشرق وسطی اور خلیجی ممالک میں جو پاکستانی وہاں معاش کے سلسلے میں مقیم ہیں اور چند سال بعد پاکستان واپس آجاتے ہیں لہذا مشرق وسطی میں مقیم رفقاء تنظیم کو تنظیم اسلامی پاکستان ہی کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور ان کا براہ راست رابطہ مرکزی دفتر تنظیم اسلامی پاکستان سے ہے جبکہ بقیہ بیرون پاکستان مقیم رفقاء جو برطانیہ اور امریکہ وغیرہ میں رہتے ہیں' عموما وہاں منتقل ہوچکے ہیں اور وہاں کے شہری ہیں' کم ہی امید کی جاتی ہے کہ وہ پاکستان واپس آئیں گے۔ اس بنا پر وہاں کے حالات کے مطابق ان کے لئے مختلف نظم کی ضرورت ہے اور انہیں تنظیم اسلامی پاکستان کا حصہ شمار نہیں کیا جاتا۔ وہ ناظم اعلی برائے بیرون پاکستان جناب سراج الحق سید کی زیر نگرانی کام کرتے ہیں۔

مشرق وسطی میں اس وقت رفقاء کی کل تعداد دو سو چونتیس (۲۳۴) ہے جن میں سے تنظیم اسلامی ابو ظبی ایک صد تیس (۱۳۰) ' تنظیم اسلامی شارجہ اٹھائیس (۲۸)' تنظیم اسلامی جدہ پندرہ (۱۵) ' تنظیم اسلامی الریاض اکتیس (۳۱) ' تنظیم اسلامی الواسیع اکیس (۲۱) ' اسرہ دھران (الجبیل) چھ (۶) اور منفرد رفقاء جن کا تعلق مصر' اردن اور نیوزی لینڈ سے ہے کی تعداد تین ہے۔ ان میں سے اکثر تنظیمیں کافی فعال ہیں اور وہاں نظام العمل کے مطابق کام ہو رہا ہے۔ کئی تنظیمیں مزید ذیلی اسرہ جات میں تقسیم ہیں۔ ان کا مرکزی دفتر پاکستان سے رابطہ مسلسل اور باقاعدہ قائم ہے' ماہانہ رپورٹس باقاعدگی سے موصول ہوتی ہیں اور مرکزی دفتر کی جانب سے انہیں باقاعدہ ہدایات دی جاتی ہیں۔

ان کے علاوہ بیرون ملک رفقاء کی کل تعداد چالیس (۴۰) ہے جن میں تنظیم اسلامی شمالی امریکہ تیرہ ' تنظیم اسلامی پیرس آٹھ اور تنظیم اسلامی لندن سے متعلق رفقاء کی تعداد انیس (۱۹) ہے۔ مشرق وسطی اور دیگر بیرون ملک رفقاء میں سے تین درجن کے لگ بھگ رفقاء اس سالانہ اجتماع میں شرکت کے لئے تشریف لائے اور ان میں سے کئی

رفقاء سالانہ اجتماع سے متصلاً قبل منعقد ہونے والی مبتدی ر ملتزم مشترکہ تربیت گاہ میں بھی شریک ہوئے۔ بیرون ملک مقیم رفقاء سے چونکہ پاکستان میں مقیم رفقاء زیادہ شناسا نہیں ہوئے لہٰذا سالانہ اجتماع کے موقع پر تمام بیرون ملک رفقاء کا فرداً فرداً تعارف کرایا گیا اور ان میں سے نمائندہ افراد نے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔

رپورٹ تحریک خلافت

تحریک خلافت کی رپورٹ تحریک کے ناظم اعلیٰ جناب عبدالرزاق صاحب نے پیش کی۔ آپ نے تحریک کا پس منظر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی تفصیلات اس سے قبل مختلف مواقع پر آپ کے گوش گزار ہو چکی ہیں۔ سال کے دوران ہی تحریک خلافت کا یہ انتہائی اہم اور بنیادی مسئلہ درپیش ہوا۔ اوائل مئی ۹۱ء میں جمہوریت کی اصطلاح ترک کرنے اور خلافت کی اصطلاح اختیار کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس کے بعد مشاورتی مراحل کا ایک دراز سلسلہ شروع ہوا جو کہ ہر سطح پر مکمل ہوا اور ان سے گزر کر تحریک خلافت کا ایک الگ نظم قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

خلافت کی مسنون و ماثور اسلامی روایات اور عوام الناس کی ذہنی اور نفسیاتی سطح سے قریب تر اور قابل فہم اصطلاح کی عوام الناس کی جانب سے بھرپور تائید و پذیرائی ہوئی۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی تدبیر خاص اور فضل و احسان کا مظہر تھا کہ عوامی سطح پر تنظیم اسلامی کی دعوت و پکار اس کے اہداف و مقاصد کی تشریح و توضیح کا عنوان "خلافت" قرار پایا چنانچہ اس تحریک کے قیام کے بعد پہلے سے توسیع دعوت کے ضمن میں طے شدہ پروگراموں اور رابطہ عوام کی کوششوں کا رخ اسی جانب مڑ گیا۔ اس کے لئے مناسب لٹریچر تیار کیا گیا اور پاکستان کے قریباً تمام بڑے شہروں میں جلسہ ہائے عام منعقد کئے گئے جن میں کراچی، لاہور، فیصل آباد، ملتان، راولپنڈی، پشاور، ڈیرہ اسماعیل خان، بنوں، کوہاٹ، گوجرانوالہ، گجرات، سرگودھا، صادق آباد اور رحیم یار خان شامل ہیں۔

تین مارچ ۹۲ء کو البدر ہوٹل راولپنڈی میں معاونین تحریک خلافت کا ایک کنونشن ہوا جس میں تحریک خلافت کے اغراض مقاصد، ہیئت تنظیمی اور نظام العمل سے متعلق ایک قرار داد کی منظوری دی گئی جس کے مطابق تحریک خلافت ایک خود مختار جماعت ہوگی اور اسے باقاعدہ "رجسٹر" کرایا جائے گا۔ اس کا ایک بیت المال ہوگا جس کے سالانہ سرکاری سطح پر آڈٹ بھی کرایا جائے گا۔ ایک خلافت کمیٹی قائم کی جائے گی اور علاقائی سطح پر ذیلی خلافت کمیٹیاں قائم کی جائیں گی۔

عبوری دور کے لئے یعنی جب تک کہ تحریک کو باقاعدہ رجسٹر نہیں کرالیا جاتا، ایک عبوری ڈھانچہ کی منظوری دی گئی اور عارضی طور پر مختلف علاقوں کے لئے کنوینز مقرر کر دیئے گئے۔ جونہی انتظامی مراحل طے ہوگئے، باقاعدہ انتخابات کے ذریعہ نئے عہدہ داروں کا تقرر عمل میں لایا جائے گا۔

قبل ازیں باقاعدہ سرگرمیوں کا زور و شور سے آغاز ہوچکا ہے ۔ پورے ملک میں جلسہ ہائے عام کے علاوہ متعدد مقامات پر درجنوں کارنر میٹنگز ہو چکی ہیں اور اسے ایک تحریک کی شکل دے کر شرکاء سے معاونت بھی طلب کی گئی جس کے نتیجہ میں حاضرین کی اوسطاً دس فیصد تعداد نے تحریک خلافت کا معاون بننے کے لئے تعاون فارم پر کئے۔ ان جلسوں میں سامعین کی حاضری پانچ صد سے ڈھائی ہزار تک رہی۔ اب تک معاونین خلافت کی تعداد اندرون ملک و بیرون ملک دو ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔ تنظیم اسلامی کے رفقاء بھی چونکہ تحریک خلافت کے معاونین میں شامل ہیں لہٰذا اس طرح کل تعداد ساڑھے تین ہزار سے متجاوز ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن آڈیٹوریم میں سے ایک خلافت سیمینار بھی منعقد کیا گیا تھا جس میں مختلف مکتبہ ہائے فکر کے علماء و دانشور حضرات نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں جناب مولانا عبدالرحمٰن اشرفی، جناب مفتی غلام سرور قادری، جناب رشید گنگوہی، جناب صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی، جناب ڈاکٹر محمد امین، جناب شاہد علی بابر اور جناب معین الدین شاہ ایڈوکیٹ شامل ہیں۔

ناظم تحریک خلافت جناب عبد الرزاق صاحب نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس قدر پذیرائی محض اللہ تعالیٰ کی مدد ہی کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ آئندہ سال کے لئے ہمارا ہدف یہ ہے کہ کم از کم تحصیل ہیڈ کوارٹر تک کی سطح پر ہم تحریک خلافت کے پروگرام کو لے کر جائیں گے اور جلسہ عام کا انعقاد کیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

رپورٹ حلقہ خواتین

حلقہ خواتین کی رپورٹ جناب ڈاکٹر عبد السمیع نے پیش کی۔ انہوں نے کہا کہ گو شہادت علی الناس کی اصل ذمہ داری مردوں پر ہے لیکن اس کے لئے جب تک عورتوں کا تعاون حاصل نہ ہو، کام کیلئے آگے بڑھنا بہت دشوار ہے لہٰذا اس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ۱۹۸۳ء سے کسی نہ کسی صورت میں حلقہ خواتین کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ان میں دین کا صحیح فہم و شعور پیدا ہوتا ہے اور وہ ایک طرف تو اپنے مردوں کی اس کام میں حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور دوسری طرف اپنی اولاد کی صحیح اسلامی تربیت کرکے انہیں آئندہ کے لئے تیار کرتی ہیں۔ اگرچہ عورتوں اور مردوں کا دائرہ کار الگ الگ ہے لیکن آخرت میں نجات کیلئے دونوں اپنی اپنی جگہ مسئول ہیں۔

گزشتہ دو سال سے خواتین کی دعوتی سرگرمیوں میں کافی اضافہ و ترقی ہوئی ہے۔ اس وقت ایک سو اسی (۱۸۰) خواتین باقاعدہ بیعت کرکے تنظیم اسلامی میں رفیقہ کی حیثیت سے شامل ہیں۔ خواتین کا اپنا بالکل علیحدہ نظم قائم ہے جس کی ناظمہ امیر محترم کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ ان کا علیحدہ ایک باقاعدہ دفتر قرآن اکیڈمی لاہور میں قائم ہے جہاں سے باقاعدہ خواتین سے بذریعہ خطوط رابطہ رکھا جاتا ہے۔

حلقہ خواتین لاہور سب سے زیادہ فعال ہے جہاں (۹۰) رفیقات ہیں۔ لاہور کے ایک درجن سے زائد مقامات پر خواتین کے مختلف پروگرام ہوتے ہیں جن میں سے دروس قرآن، عربی کلاسز، ترجمہ قرآن کی کلاسز، دروس حدیث اور دیگر دینی دعوتی پروگرام شامل ہیں۔ ایک مقام پر خواتین کے زیر اہتمام بچوں کی کلاس بھی ہوتی ہے جس میں ان کو سہل انداز میں دین کی باتیں بتائی جاتی ہیں۔ کئی مقامات پر پروگرام ماہانہ اور کچھ مقامات پر ہفتہ وار ہوتے ہیں مختلف مقامات پر حاضری بیس سے لے کر سو سے زائد ہوتی ہے۔

کراچی میں رفیقات کی کل تعداد سینتالیس (۴۷) ہے اور وہ تین اسرہ جات ڈیفنس، گلشن اقبال اور ناظم آباد میں منقسم ہیں۔ جہاں ان کے باقاعدہ پروگرام ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے

دیگر کئی شہروں میں خواتین کے پروگرام ہوتے ہیں جن میں اسلام آباد، راولپنڈی، پشاور، سرگودھا، فیصل آباد، گجرات، فیروز والہ اور کوئٹہ شامل ہیں ۔ ابو ظہبی میں بھی حال ہی میں پانچ خواتین تنظیم اسلامی کی رفیقہ بنی ہیں۔ دوران سال جون ۹۱ء میں قرآن اکیڈمی لاہور میں خواتین کا ایک روزہ سالانہ اجتماع بھی منعقد ہوا جس میں لاہور اور بیرون لاہور سے چار صد (۴۰۰) سے زائد خواتین نے شرکت کی جس میں دیگر پروگراموں کے علاوہ امیر محترم نے بھی خواتین سے خطاب فرمایا۔ اسی طرح اکتوبر ۹۱ء میں قرآن اکیڈمی لاہور ہی میں ایک تین روزہ تربیت گاہ منعقد ہوئی جس کا دورانیہ صبح سے نماز ظہر تک ہوتا تھا اس میں روزانہ ایک صد تا ڈیڑھ صد حاضری رہی۔ اس میں بھی مختلف تنظیمی و دعوتی پروگرام کے علاوہ امیر محترم نے بھی خطاب فرمایا۔ کئی مقامات پر خواتین کی کتب اور آڈیو وڈیو لائبریریاں بھی کام کر رہی ہیں۔

امیر محترم کے تاثرات

امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے رپورٹوں پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی گفتگو کا آغاز سورۂ کہف کی اس آیت سے کیا" **لو لا اذ دخلت جنتک قلت ما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ**" "یعنی جب تو اپنے باغ میں داخل ہو رہا تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ کیوں نہ نکلا کہ جو کچھ اللہ چاہے گا وہی ہوگا اور کوئی قوت نہیں سوائے اللہ کے " آپ نے کہا کہ ایک بندہ مومن کے شایان شان یہی ہے کہ وہ اپنی تمام تر کار گزاری کو اللہ کے فضل سے منسوب کرے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

آپ نے تبصرہ کو سورۂ فتح کی اس آیت سے مزین کیا " **کزرع اخرج شطئہ فازرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار و عد اللہ الذین امنو و عملوا الصلحت منھم مغفرۃ و اجرا عظیما** ○ یعنی گویا کہ ایک کھیتی جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا"۔

انہوں نے کہا کہ آج میری کیفیت بھی اس کسان جیسی ہی ہے جو اپنی کھیتی کو لہلہاتے دیکھ رہا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ اس آیت مبارکہ کے آخری ٹکڑے سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ یوم حساب محاسبہ فرداً فرداً ہوگا اور سب کو اپنے اپنے عمل کا ہی پھل ملے گا لہٰذا ہم سب کو یہ بات بہت اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ محض کسی تنظیم میں شمولیت ہی کافی نہیں بلکہ ہر وقت اپنی نیت اور کارکردگی پر نظر رکھنا لازمی ہے۔ الحمد للہ ہم ایک تدریج کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنے ہدف کی جانب گامزن ہیں اور رپورٹوں میں مبالغہ آرائی سے گریز کرتے ہوئے رفتار کار کا حقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

امیر محترم کے اس تبصرہ کے ساتھ ہی پہلے روز کی کارروائی کا اختتام ہوا، جس کے بعد رفقاء نے نماز عشاء باجماعت ادا کی اور عشائیہ تناول کیا ۔ بقیہ تین روز کے پروگرام کچھ اس طرح رکھے گئے تھے کہ پروگرام کا آغاز نماز فجر سے ہوتا جو سب رفقاء جامع القرآن، قرآن اکیڈمی میں اکٹھے ہی ادا کرتے تھے۔ نماز سے قبل نماز فجر میں تلاوت کی جانے والی آیات قرآنی کا ترجمہ و مختصر تشریح امیر محترم پیش کرتے تاکہ نماز میں جب تلاوت قرآن مجید کی جائے تو "قران الفجر" کا حق ادا ہوسکے چنانچہ جب رفقاء نماز میں کھڑے ہو کر تلاوت سنتے تھے تو اس کا مفہوم ساتھ ہی ساتھ دل میں اترتا چلا جاتا اور روحانی کیف وسرور کی ایک عجیب فضا پیدا ہوجاتی تھی۔ نماز فجر کے بعد وہیں امیر محترم کے فیض یافتہ نوجوان مدرسین درس قرآن دیتے تھے ان تین دنوں میں بالترتیب جناب ڈاکٹر طاہر خاکوانی (ملتان)، جناب ڈاکٹر عبدالسمیع (فیصل آباد) اور جناب ڈاکٹر عارف رشید (لاہور) نے درس قرآن دیا۔

بعد ازاں صبح نو بجے تک ناشتہ و دیگر ضروریات کے لئے وقفہ ہوتا تھا۔ نو بجے اجلاس اول کا آغاز ہوتا تھا جس کا دورانیہ دو گھنٹہ تھا۔ گیارہ تا ساڑھے گیارہ بجے چائے کے لئے وقفہ اور پھر دوسرا اجلاس ساڑھے گیارہ تا ساڑھے ایک بجے دوپہر تک چلتا تھا جس کے بعد نماز ظہر، ظہرانہ اور آرام کے لئے وقفہ ہوتا تھا۔ تیسرا اجلاس نماز عصر کے بعد پانچ بج کر پچیس منٹ پر شروع ہو کر نماز مغرب تک چلتا اور چوتھا اور آخری اجلاس بعد نماز مغرب تا اختتام جلسہ تک رہتا تھا۔ نماز عشاء تاخیر سے ادا کرنے کے لئے جماعت اولیٰ اور جماعت ثانی کا اور اس کے بعد عشائیہ کا اہتمام ہوتا تھا۔ اس طرح صبح درس قرآن کی نشست شامل کر کے روزانہ پانچ نشستوں میں تقریباً آٹھ گھنٹے کی کارروائی ہوتی رہی، البتہ آخری روز یعنی ۲۰ر اپریل کو نماز ظہر تک اجلاس جاری رہنے کے بعد اختتام کو پہنچا۔

سالانہ اجتماع کے اکثر پروگرام تنظیمی و دعوتی نوعیت کے تھے جس میں درس قرآن کی صبح فجر کی نشست کے علاوہ دیگر قرآنی دروس کی نشستیں بھی تھیں کیونکہ سالانہ اجتماع کا مقصد ہی اپنی تنظیمی کارکردگی کا جائزہ اور رفقاء کی تربیت ہوتا ہے تاکہ ایک تو وہ مختلف مقامات کی تنظیمی حالت سے آگاہ ہوسکیں اور ثانیاً اپنی فکر کے ساتھ ایمان کی پختگی میں اضافہ ہوتا رہے۔ نیز اگر ان کے کوئی مسائل ہوں، کچھ اشکالات ہوں تو ان کو بھی باہمی افہام و تفہیم سے رفع کرنے کا موقع مل سکے۔ تاہم زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل رہی کہ تنظیم کا بنیادی فکر ساتھیوں کے ذہن میں پختہ تر ہوجائے اور یہی وجہ ہے کہ امیر محترم نے اپنے ایک خطاب میں سالانہ اجتماع کے مقاصد کا احاطہ ایک لفظ " تذکیر" یعنی یاد دہانی سے کیا۔

چنانچہ ایک اہم تربیتی پروگرام مطالعہ لٹریچر تھا۔ دو مختلف نشستوں میں امیر محترم نے تنظیم اسلامی کی "قرار داد تاسیس" اور "فرائض دینی کا جامع تصور" کا خود مطالعہ کرایا اور اس کی توضیح و تشریح، شرح و بسط سے کی۔ یہ پروگرام نہایت جامع، موثر اور دلچسپ تھا۔ اس پروگرام سے جہاں رفقاء کو تنظیم کے آغاز سے آج تک کی تاریخ سے آگاہی ہوئی وہیں ان میں اقامت دین کی فرضیت کا احساس بھی تازہ ہوگیا۔

مطالعہ لٹریچر کے آغاز ہی میں امیر محترم نے جب یہ کہا کہ " جب بھی کہیں کسی رفیق کے پاؤں رکتے ہوئے محسوس ہوں، کوئی اضمحلال محسوس ہو تو ایک ہی وجہ ہوتی ہے اور وہ یہ کہ بنیادی تصورات میں کہیں کوئی خامی رہ گئی ہے " تو رفقاء کا انہماک دیدنی تھا۔ آپ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ تنظیم کے بنیادی تصورات میں تین چیزوں کو بنیادی اور اہم حیثیت حاصل ہے:

۱۔ فرائض دینی کا جامع تصور
۲۔ منہج انقلاب نبویؐ

۳۔ نظام بیعت کے تقاضے

انہوں نے فرمایا" ہمیں ہر وقت اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ ہمارے کام کے پس پشت سوائے احساس فرض کے اور کوئی جذبہ کار فرما نہ ہو کہیں کوئی جذبہ خود نمائی ' کوئی ذوق انجمن آرائی یا کوئی قومی جذبہ ہم پر مسلط نہ ہو جائے۔" امیر محترم نے مزید فرمایا کہ " اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طور پر بروئے کار لانے میں کوئی حرج نہیں لیکن نتائج سے خود کو ذہنی طور پر دستکش کرکے کامیابی و ناکامی کو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشاء پر چھوڑ دیا جائے۔"

درمیانی دو روز کے بعد نماز مغرب کی نشستیں امیر محترم کے دو پر مغز خطابات پر مشتمل تھیں۔ پہلے روز انہوں نے امت مسلمہ کا ماضی اور حال اور دوسرے روز " اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل" کے موضوع پر نہایت جامع تقاریر کیں ان خطابات میں رفقائے تنظیم کے علاوہ کثیر تعداد میں مقامی احباب اور ارباب علم و دانش نے شرکت کی قرآن آڈیٹوریم کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ کرسیوں کے علاوہ اسٹیج کے اوپر اور کرسیوں اور اسٹیج کے درمیان وسیع خالی جگہ بھی سامعین سے پر ہوگئی اس کے علاوہ خواتین انکلوژر میں بھی "ہاؤس فل" تھا۔ آڈیٹوریم کے باہر بھی کلوز سرکٹ ٹی وی کے ذریعہ خطاب سننے کا انتظام کیا گیا تھا ' وہاں بھی دریاں پر ہو چکی تھیں۔ اس کے علاوہ ہال کے نیچے ایک دو مقامات پر لاؤڈ سپیکر لگائے تھے تاکہ وہاں بھی آواز پہنچتی رہے۔

امیر محترم نے دو روز تقریباً ڈھائی ڈھائی گھنٹے خطاب فرمایا اور ماضی ' حال اور مستقبل کا کوئی گوشہ نظروں سے اوجھل نہ رہنے دیا۔ آپ نے نہ صرف امت مسلمہ کے عروج و زوال کے دو ادوار تفصیلاً بیان کئے بلکہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے حوالہ سے موجودہ احیائی مساعی کے تناظر میں تنظیم اسلامی کا محل و مقام بھی متعین کیا۔ انہوں نے کہا کہ سابقہ امت مسلمہ یعنی یہود اور موجودہ امت مسلمہ کو پیش آنے والے حالات و واقعات میں حد درجہ مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے اور اس کی خبر آج سے چودہ سو سال قبل نبی آخر الزمانؐ نے دے دی تھی جب آپؐ نے فرمایا کہ لیاتین علی امتی ما اتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ راوی ہیں کہ آنحضورؐ نے فرمایا " میری امت پر بھی وہ تمام حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے ' بالکل ایسے جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے سے مشابہ ہوتا ہے"۔

یہود نے اللہ کی کتاب اور انبیاء کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کا رویہ اختیار کیا جس کی پاداش میں اللہ نے انہیں اپنے غضب کا مستحق قرار دیا اور ان کے کرتوتوں کی سزاء کے طور پر بخت نصر ' ٹائیٹس رومی اور ہٹلر جیسے حکمرانوں کے ہاتھوں ذلیل و رسوا کروا دیا۔ یہود لاکھوں کی تعداد میں قید اور قتل ہوئے اور انہیں غلامی جیسی ذلت سے دوچار ہونا پڑا۔ انہوں نے اپنے خطاب کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اسی طرح جب موجودہ امت مسلمہ نے بھی دین و شریعت سے روگردانی کی تو انہیں تاتاریوں ' صلیبیوں اور مغربی استعمار کے ہاتھوں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا اور اس امت کی حالت وہ ہوگئی کہ بقول حالی۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ امت مسلمہ بحیثیت مجموعی مادہ پرستی کے اس شرک میں مبتلا ہو چکی ہے جسے علامہ اقبال مرحوم نے مال و دولت دنیا اور رشتہ و پیوند کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

یہ مال و دولت دنیا ' یہ رشتہ و پیوند
بتان وہم و گمان ' لا الہ الا اللہ

مسلمانوں کے موجودہ زوال اور پستی کا دوسرا سبب اللہ کی راہ میں جہاد سے پہلو تہی اور شہادت کی موت سے گریز اختیار کرنا ہے۔

آ تجھ کو بتاتا ہوں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

انہوں نے کہا کہ اگر مسلمان دوبارہ دنیا میں عزت و وقار کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو انہیں دین کو جامع اور ہمہ گیر شکل میں پھر سے دنیا پر غالب کرنا ہوگا۔ دین کا یہ غلبہ سیرت نبویؐ کی روشنی میں جہاد فی سبیل اللہ کی جدوجہد کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے اور بقول جگر مراد آبادی مرحوم۔

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ دین کا درد رکھنے والے تمام افراد اس کے غلبہ اور نفاذ کے لئے کام کرنے والے اداروں اور جماعتوں کو مخلصانہ طریقے سے اس بات کی مسلسل کوشش کرنا ہوگی کہ عوام الناس کے سامنے دین کا ایسا انقلابی تصور پیش کیا جائے جو موجودہ فرقہ وارانہ تصورات سے بھی مکمل طور پر پاک ہو اور اس میں سیاسی معاشی اور سماجی شعبوں میں عدل و انصاف اور آزادی و حریت اور اخوت و مساوات کے اسلامی تصورات بھی کار فرما ہوں۔

خطاب جاری تھا اور حالانکہ وقت کافی ہو چکا تھا لیکن سخت گرمی اور گھٹن میں بھی کسی کی نظر گھڑی کی طرف نہ تھی بلکہ "وقت" کی طرف تھی "وقت" جو ماضی ہے" وقت" جو حال ہے اور "وقت" جو مستقبل ہے لیکن وقت ' وقت کی بات ہے۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!

کیا آج کے مسلمان نوجوان کو معلوم ہے کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب عرب افواج جبل الطارق سے شمال مشرق کی جانب بڑھتی ہوئی فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی ہیں اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ترک افواج پورے مشرقی یورپ کو روندتی ہوئی ویانا کے دروازوں تک پہنچی ہیں؟ نہیں ' معلوم ! معلوم ہو بھی کیسے ! لیکن اب تو معلوم ہوگیا ' اب تو تجھے معلوم ہو جانا چاہیے ! یہ محفل تیرے لئے ہی تو سجائی گئی ہے تجھے آگاہ کرنا ہی تو مقصد ہے تجھے وقتی ہنگاموں میں مشغول کرنے والے بہت ' تجھے اپنے سیاسی مفادات کی بھینٹ چڑھانے والے بہت ' تجھے اقتدار کا زینہ بنانے والے بہت ہیں ' ہاں بہت ہیں لیکن ایک اکیلا ' سہی ' تجھے تیرا بھولا ہوا سبق یاد دلانے والا کوئی تو ہے۔ یہ کون ہے ؟ وہی جو تجھے تیرا بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے ' تجھے آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر دکھا رہا ہے جس میں رنگ بھرنے کے لئے تجھے اپنے آپ کو صبغت اللہ میں رنگنا ہوگا۔

ایک بلبل ہے کہ ہے محو ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

اختتامی خطاب امیر محترم

امیر محترم نے نئے تنظیمی سال کے لئے اہم فیصلوں سے رفقاء کو آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ اس اجتماع سے متصلاً قبل مرکزی مجلس مشاورت کے اجلاس میں ہم نے بہت سی باتوں پر غور و خوض کے نتیجہ میں چند فیصلے کئے اور آئندہ کے اہداف

بھی مقرر کئے ہیں۔ دوسری ہم عصر تحریکوں اور جماعتوں کے بارے میں ہم نے ہمیشہ ذہن میں کشادگی رکھی ہے لیکن ماضی میں ہم نے ان سے روابط کی کبھی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ اب ہمیں اس جانب توجہ دینی ہے۔ اگر ہمیں اپنے فکر پر پختہ یقین ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم انہیں متاثر نہ کرسکیں۔ ہمیں اپنے فکر میں پختگی اور شدت پیدا کرنی چاہیے فرائض دینی کا جامع تصور اور منہج انقلاب نبویؐ پر مبنی فکر کے ذریعہ ان حلقوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

تحریک خلافت کے پروگرام میں ہمیں حتی الامکان توسیع کرنی ہے لیکن اس سلسلہ میں ابتدائی کام جلسہ ہائے عام کی شکل میں ہوچکا ہے، میری بات لوگوں تک پہنچ چکی، تقریروں کے ذریعے، پریس کانفرنسوں کے ذریعے اور اخباری مضامین کے ذریعے تحریری مواد بھی اب موجود ہے لہٰذا اب یہ کام میری بجائے قیادت کی دوسری صف نے کرنا ہے۔ اب دعوتی کام کا زیادہ تر بوجھ مقامی ذمہ داروں کو خود اٹھانا ہوگا۔ میں ہر تین ماہ میں صرف ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کروں گا۔ اب درجہ بدرجہ قیادت تیار ہوچکی ہے۔ اسے پوری طرح میدان میں آجانا چاہیے۔

خاموش مظاہروں کے سلسلے میں امیر محترم نے فرمایا کہ یہ جاری رہیں گے لیکن اب انہیں زیادہ بڑی سطح پر کیا جائے، خواہ کم ہوں لیکن حلقہ کی سطح پر، ثانیاً اب حساس مقامات کے آمنے سامنے مثلاً گورنر ہاؤس، پارلیمنٹ ہاؤس وغیرہ تک ان مظاہروں کو پہنچانے کی کوشش کی جائے تاہم ابھی یہ مظاہرے پر امن اور خاموش رہیں گے اور صرف بہت اہم مسائل پر ہوں گے۔ مبتدی و ملتزم تربیت گاہوں پر خصوصی توجہ مرکوز رہنی چاہیے اور ذمہ داران اپنے دوروں میں رفقاء کو ان کے لئے تیار کریں۔

تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے توسیع دعوت کے کام کے ضمن میں امیر محترم نے بہت محتاط رہنے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ اس سے تنظیم کا کام متاثر نہ ہو دو روزہ اور سہ روزہ پروگراموں کا جو سلسلہ تحریک خلافت کے جلسہ ہائے عام کی وجہ سے رک گیا تھا، اس میں تعطل کو دور کیا جائے۔ تحریک خلافت اور تنظیم اسلامی کو متوازن انداز میں لے کر چلنے کی اشد ضرورت ہے اگر اس میں غیر متوازن رویہ اختیار کیا گیا تو یہ سرا سر گھاٹے کا سودا ہوگا۔

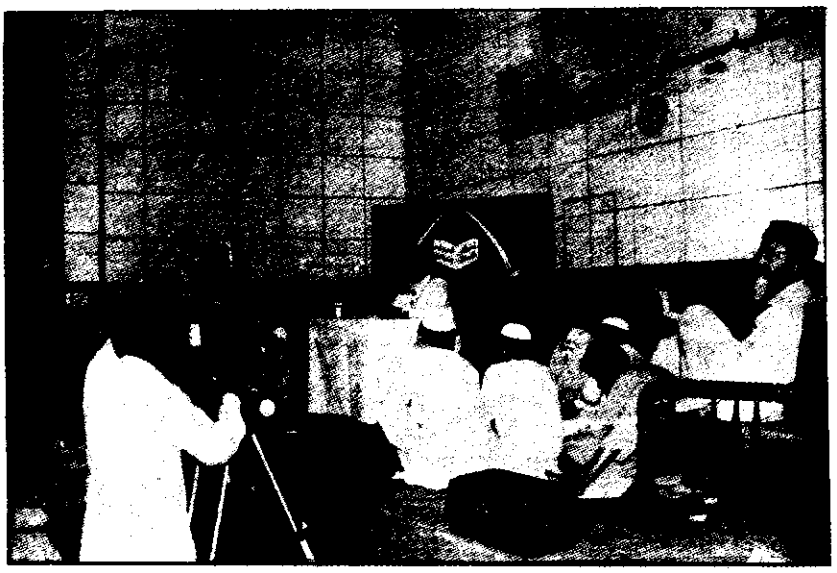

نظام بیعت کے لوازم، مضمرات، مقدرات پر بات کرتے ہوئے امیر محترم نے اس بات کو واضح کیا کہ کفر بواح کے بغیر محض تدبیر پر اختلاف کی بنیاد پر بیعت سے روگردانی جائز نہیں البتہ اگر داعی کی نیت اور اس کے اخلاص پر ہی اعتماد نہ رہے تو بیعت کی تنسیخ فرض ہوجاتی ہے۔

آئندہ سالانہ اجتماع کے بارے میں امیر محترم نے کراچی لاہور یا کسی دوسرے بڑے شہر میں کھلی جگہ کے انتخاب کی ہدایت کی۔ انہوں نے فرمایا کہ اب قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج سے باہر نکل کر پبلک مقامات پر سالانہ اجتماع کرنے کی کوشش کی جائے خواہ اس کا دورانیہ تین چار روز سے کم کر کے دو روز کردیا جائے۔ آپ نے آئندہ سالانہ اجتماع کے لئے حلقہ شمالی پنجاب کے ناظم جناب شمس الحق اعوان کو ناظم اجتماع اور نائب ناظم جناب میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد کو مقرر کیا۔

قرآن آڈیٹوریم میں اسٹیج کا ایک عمومی منظر

یہ سالانہ اجتماع کا آخری پروگرام تھا۔ اس اجتماع میں تقریباً چھ صد رفقاء نے ہمہ وقت شرکت کی ۴۰ طلبہ اس کے علاوہ ہیں جو قرآن کالج ہاسٹل میں مقیم ہیں۔ دس خواتین نے بھی مقیم رہ کر اجتماع میں شرکت کی جبکہ جز وقتی شرکت کرنے والے احباب و خواتین کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ انتظامات کے لحاظ سے یہ ایک مثالی اجتماع تھا رفقاء کی تقسیم کار بہت خوب تھی۔ رفقاء نے بھی منتظمین سے حتی الامکان تعاون کیا تاہم کوتاہیوں کے امکان کو تو خارج نہیں کیا جاسکتا جس کے لئے ناظم اجتماع جناب میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد نے شرکاء سے پر خلوص معذرت طلب کی اور ظاہر ہے کہ ان سمیت انتظام کے ذمہ دار ان کے سب معاون رفقاء نے ایک تجربہ اور حاصل کرلیا جس سے وہ بتائید ایزدی آئندہ فائدہ اٹھائیں گے۔

اجتماع کے اختتام پر امیر محترم دعا فرما رہے تھے جس کے دوران ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو ندیاں رواں ہوگئیں ان کے پیچھے، سر کے اوپر دیوار پر بینر آویزاں تھا۔۔

بیا تا کار ایں امت بسازیم
قمار زندگی مردانہ بازیم

اور لب پہ دعا تھی **الحمد للہ الذی ھدانا لھذا و ما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔ ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا و ھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب** رفقاء سر جھکائے آمین ثم آمین پکار رہے تھے۔ دعائیں، سابقہ کوتاہیوں سے مغفرت کی دعائیں، آئندہ عزائم کے لئے مدد کی دعائیں، خیر و عافیت کی دعائیں، جانے والے والوں کے لئے دعائیں، دل کی صدائیں، خاموش دعائیں ...... لیکن ان سب پر بھاری ہیں وہ آنسو جو امیر محترم کی آنکھوں سے گرتے ہوئے زبان سے کہہ رہے تھے۔۔

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

برہمن کی عیاری اور سکھ قوم کی سادگی

سکھوں نے بھارتی پنجاب میں مسلمانوں کو نہیں ' اپنے مستقبل کو تہ تیغ کیا

(آخری قسط)

پروفیسر مرزا محمد منور کی کتاب کے اس باب کا ترجمہ محمد یوسف عرفان نے کیا

سکھ ہمیشہ گاندھی جی اور کانگریس پر بھروسا کرتے رہے تاکہ وہ آزاد پنجاب کے سکھ مطالبے کی مدد کریں ۔ اسی خیال سے انہوں نے گول میز کانفرنس میں اس مطالبے کو زور دے کر پیش کیا تھا ۔ انہوں نے گاندھی جی سے یہ بھی مطالبہ کر رکھا تھا کہ وہ لارڈ اروِن کے ساتھ مجوزہ گفت و شنید کے دوران میں بھی سکھوں کے اس مطالبے کو سامنے لائیں ۔ لیکن ہوا یہ کہ گاندھی جی اور کانگریس نے کمیونل ایوارڈ کی مخالفت نہ کی ۔ قدرتی امر ہے کہ اس سے سکھوں کی سخت دل شکنی ہوئی ۔ اور انہیں احساس اہانت ہوا ۔ ہندوؤں کے ہاتھوں ایسی چوٹ کھانے کے باوجود سکھ مسلمانوں کے ساتھ پنجاب کے مستقبل کے ضمن میں معاملات طے کرنے پر آمادہ ہوتے دکھائی نہ دیے۔

اس (مسلم سکھ) دوری میں مسجد شہید گنج کے المیے نے اور بھی وسعت پیدا کردی ۔ اس دور میں سر فضل حسین اور سر سکندر حیات نے بڑے سکھ جاگیرداروں کی مدد حاصل کر لی تھی تاکہ وہ یونینسٹ پارٹی کی قوت بڑھائیں ۔ سکھوں کے اکثر و بیشتر معاملات کا تعلق پنجاب سے تھا ۔ جہاں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق ہے وہ فقط پنجاب سے وابستہ نہ تھے ۔ ان کا مقدر پورے برعظیم کے ساتھ وابستہ تھا ' لہٰذا کل ہند معاملات پنجاب کو یہ اجازت نہ دے سکتے تھے کہ وہ ہندوستان کے مرکز سے ہٹ کر الگ جا کھڑا ہو ۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ سکھ پنجاب کی حدود سے باہر بمشکل ہی نظر ڈالتے تھے گو ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ جمہوریت پسند لوگ ہیں تاہم اس حقیقت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ ایک خالصہ کا ووٹ ایک ہے ۔ ان کے خیال میں ایک خالصہ سوا لاکھ کے برابر تھا ۔ یوں ایک مسلمان کا ووٹ اور ایک خالصہ کا ووٹ برابر کیسے ہو سکتا تھا ۔ حق یہ ہے کہ سکھ قوم کا یہ واہمہ جمہوریت کا سرا سر مخالف تھا۔

جب ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو قرار داد پاکستان منظور ہوئی تو سکھوں نے بڑا جارحانہ رویہ اختیار کر لیا ۔ مسلمانوں نے برعظیم کے اندر جب مملکت پاکستان کا مطالبہ کیا تو ظاہر ہے کہ پنجاب اس کا جزو لاینفک قرار پاتا تھا ' لہٰذا سکھوں نے مسلمانوں کے اس مطالبے کے خلاف شدید غم و غصے کا اظہار کرنا شروع کردیا ۔ ہندی مسلمانوں کے مطالبے کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے سکھوں نے خالصتان یعنی سکھ سٹیٹ کا نعرہ بلند کردیا ۔ اس کے باوجود وہ کوئی بہت زیادہ ہیجان کی کیفیت میں نہ تھے ۔ سبب اس کا یہ تھا کہ پاکستان کا مطالبہ فقط مسلم لیگ نے کیا تھا اور مسلمانوں کی دیگر سیاسی جماعتیں اس مطالبے کی مخالف تھیں اور وہ کھلے بندوں تقسیم ہند کے تصور کے باب میں ناگواری کا اظہار کررہی تھی ۔ کانگریس اور ہندو مہا سبھا نے اس مطالبے کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کی اور اس ضمن میں بڑے تلخ اور تند کلمات ارشاد کئے ۔ یہی سبب ہے کہ قرار داد پاکستان کو سکھوں نے کوئی بہت زیادہ وزن نہ دیا ۔ سکھ زیادہ بے مزہ اس وقت ہوئے جب کرپس مشن سکیم کا اعلان ہوا ۔ اس سکیم کی رو سے جنگ عظیم دوم کے بعد کسی ایک صوبے یا ایک سے زیادہ صوبوں کو یہ حق دیا جانے والا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو مرکز سے الگ ہو سکیں گے۔ سکھوں اور ہندوؤں کے لئے اس اعلان میں پاکستان کے تسلیم کئے جانے کا امکان مضمر تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس سکیم کے بعد سکھوں نے آزاد پنجاب کے مطالبے پر زیادہ سے زیادہ زور دینا شروع کردیا:

"کل ہند اکالی کانفرنس کا اجلاس قصبہ واہلہ کلاں ' ضلع لائلپور میں منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے تمام علاقوں سے آنے والے قائدین نے شرکت کی ۔ اس کانفرنس کے اجلاس ۲۴ر جولائی ۱۹۴۲ء نے ایک قرار داد منظور کی جس کی رو سے مطالبہ کیا گیا کہ پنجاب کی سرحدیں از سر نو متعین کی جائیں ۔ شرومنی اکالی دل کی ورکنگ کمیٹی نے بھی (جو سکھوں کی قومی سیاسی تنظیم تھی) آزاد پنجاب کا مطالبہ کردیا ۔ اور ۷ جون ۱۹۴۳ء کو اس ضمن میں ایک قرار داد پاس کردی"

واضح ہے کہ سکھ اس دور کے پنجاب میں اپنے لئے ایک نیا صوبہ قائم کرا لینا چاہتے تھے ۔ اس مطالبے میں جو نظریہ کار فرما تھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی حاوی اکثریت کا بوجھ ایک طرف کردیا جائے ۔ سکھوں کو توقع تھی کہ مجوزہ مطلوبہ صوبے میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر وہ بڑی حد تک مسلمانوں کی مرضی کے مقابل اپنی مرضی منوا سکیں گے ۔ تاہم اب تک بھی سکھوں اور مسلمانوں کے روابط میں شدید تلخی اور کھچاؤ نمودار نہیں ہوا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ جب سردار اورنگزیب خان نے صوبے سرحد میں مسلم لیگ وزارت بنائی تو کوہاٹ کے اکالی لیڈر سردار اجیت سنگھ نے اس کابینہ میں شرکت اختیار کر لی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ۴۶۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات نے ہندوؤں اور سکھوں کو لرزا کر رکھ دیا

۔ سکھوں کی پریشانی کی تو کوئی حد نہ رہی ۔ یہ الیکشن مسلم لیگ کے اس دعوے کو ثابت یا رد کرنے کے لئے منعقد ہوئے تھے کہ سارے ہندوستان کے مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ہیں ۔اور وہ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کے سراسر حامی ہیں ۔ انتخابات کے نتائج نے واضح کردیا کہ مسلمانان برعظیم ایک ٹھوس چٹان کی طرح قائداعظم کے جھنڈے تلے متحد تھے اور انہیں ان کی محبوب منزل یعنی پاکستان کی طرف بڑھنے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا ۔ ان انتخابی نتائج نے برطانوی حکومت کو مجبور کردیا کہ وہ ایک وزارتی مشن برعظیم میں بھیجے جو ہندوستانیوں کو آزادی دے۔ ایسی آزادی جو سب ہندوستانیوں کے لئے اور خصوصا دو بڑی جماعتوں کے لئے قابل قبول ہو ۔ عیاں ہے کہ وہ دو بڑی جماعتیں کانگریس اور مسلم لیگ تھیں ۔ وزارتی مشن نے جن تجاویز کا اعلان کیا ' اس میں صوبوں کی گروپنگ تھی ۔اس گروپنگ میں دو گروپ مسلم اکثریتی صوبوں کے تھے ۔ ایک گروپ شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل تھا اور دوسرا مشرقی صوبوں پر ۔ صوبوں کی گروپنگ کو دیکھ کر پوری ہندو قوم بھونچکی رہ گئی۔ سکھ آگ بگولا ہو کر رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ پنجاب دو مسلم اکثریتی صوبوں والے گروپوں میں سے ایک کا حصہ تھا۔ اس موقع پر کانگرسی لیڈروں نے کیسے کیسے پیچ دار اور عیارانہ چالوں سے کام لیا' یہ ایک دردناک کہانی ہے۔ اور اس کے لئے ایک علیحدہ کتابچے کی ضرورت ہے مگر یہاں بھی ہندوؤں کو ایک اور موقع میسر آ رہا تھا جس کے حوالے سے وہ سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرسکتے تھے۔ اور یہاں بھی سکھ اپنے روایت بھولپن کے باعث سر تا سر ہندوؤں کے حوالے ہوگئے چنانچہ سکھوں نے وزارتی منصوبے پر بڑی تلخ تنقید وارد کی اور اس منصوبے کے ہر ہر نکتے کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اس کے باوجود جب گاندھی نے اشارہ کیا کہ پنڈت نہرو کی دعوت قبول کرلی جائے اور اپنے نمائندوں کو دستور ساز اسمبلی میں نشستیں سنبھالنے کی اجازت دی جائے تو سکھوں نے بھی اپنے نمائندوں کو یہ اجازت دے دی۔ اس طرح عملاً سکھوں نے اپنے مقدر کو ایسے نازک موقع پر بھی ہندوؤں ہی کے حوالے کئے رکھا۔ مسلم لیگ نے دستور ساز اسمبلی کی کارروائیوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

اس کے باوجود سکھوں نے مسلم لیگ کی طرف نہ دیکھا۔ حالانکہ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے' انہیں مسلم لیگ ہی سے کوئی معاملہ طے کرنا چاہئے تھا۔ الٹا مسلمانوں کے خلاف جو دلوں میں نفرت پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی وہ مزید انگارے اگلنے لگی۔

جیسا کہ سابقہ اوراق میں گزر چکا ہے سکھوں کی مسلمانوں کے خلاف ہندو ذہنوں نے گھڑی گھڑائی کہانیوں پر پرورش کی تھی اور سکھ انہی بے بنیاد افسانوں کو نسلا بعد نسلا دہراتے چلے آئے تھے اور اسی وجہ سے وہ بڑی آسانی کے ساتھ ہندوؤں کی حیلہ سازی کے دام میں گرفتار ہو کر رہ جاتے تھے۔ بہرحال اس موقع پر سکھوں کا مطالبہ آزاد پنجاب سکھ ریاست کی شکل اختیار کر گیا۔ وزارتی مشن کی تجاویز کے اعلان کے بعد ایک طرح سے تقسیم برعظیم کا عمل جاری ہوگیا۔ اس دور میں سکھوں نے سکھ سٹیٹ کے بارے میں ٹھنڈل دل سے غور ہی نہ کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنی سکھ سٹیٹ کے بارے میں سوچتے وہ اپنے ہتھیار کھڑکا کھڑکا کر بس مسلمانوں کو چیلنج کرتے رہے اور مسلسل یہ کہتے رہے کہ وہ مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دیں گے اور پاکستان نہیں بننے دیں گے۔ چاہئے یہ تھا کہ وہ اس موقع پر ہندو قائدین پر اعتماد کرنے کے بجائے مسلمان قائدین پر اعتماد کرتے جن کے ساتھ عہد و پیمان ہونے کی صورت میں وہ بہت کچھ حاصل کرسکتے تھے۔

۱۹۴۶ء میں ایک کتاب "سکھ سیاست" کے نام سے لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بہت سے سکھ قائدین کے مضامین تھے۔ مثلا ماسٹر تارا سنگھ' گیانی کرتار سنگھ' سردار کرتار سنگھ ایم ۔اے' سردار ایشر سنگھ مجھیل' سردار اجیت سنگھ ' سردار سروپ سنگھ ایم ۔اے' سردار سادھو سنگھ ہمدرد وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک نے سکھوں کو ہتھیار اٹھانے پر ابھارا۔ نیز یہ کہا کہ دستوری تحفظات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ بہتر یہ ہے کہ تلوار ہاتھ میں لے کر لڑنا شروع کردیں اور لڑتے لڑتے جان دے دیں۔ یہ غلامی کی زندگی سے بہتر ہے۔ ریاستیں ہتھیاروں کے بل بوتے پر تخلیق کی جاتی ہیں۔ ریاستیں تقاریر اور گفت و شنید کی بدولت وجود میں نہیں آتیں۔ ان سب مضمون نگاروں نے اس ماضی کا حوالہ دیا جب سکھوں کا پیلا جھنڈا لاہور کے قلعہ پر لہرا رہا تھا۔ اور اب وہ سکھ قوم کو ابھار رہے تھے کہ وہی پیلا جھنڈا دوبارہ لاہور قلعہ پر لہرا دیا جائے۔ خاص طور پر ماسٹر تارا سنگھ کے مضمون میں سوائے خون اور آگ کے کچھ نہ تھا۔

ہندو قوم یہی کچھ چاہتی تھی جو کچھ سکھوں نے کر دکھایا۔ ہندوؤں کا مقصد یہی تھا کہ سکھوں کو بھڑکا کر اس طرح مسلمانوں کی خلاف لڑنے مرنے پر آمادہ کر دیا جائے کہ وہ اپنی سکھ ریاست بھول جائیں۔ اور ہندوؤں کے دام مکر میں گرفتار ہو کر تقسیم پنجاب کا نعرہ لگائیں۔ ظاہر ہے کہ تقسیم پنجاب سے فائدہ ہندوؤں کو پہنچ رہا تھا نہ کہ سکھوں کو۔ مگر اس کا کیا علاج کہ سکھ قائدین نے اپنی قوم کے مفادات کو نظر انداز کر کے اس نازک موقع پر بھی بڑے جذباتی اور دیوانہ وار انداز میں ہندوؤں ہی کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہوگئے۔

ایک بات یہاں صاف ہو جانی چاہئے اور وہ یہ ہے کہ آیا مسلم لیگی قائدین نے سکھ لیڈروں کے پاس پہنچنے میں کوتاہی کی اور انہیں کوئی ایسی پیشکش نہ کی جس کی بدولت وہ مسلم لیگ کی طرف کھنچتے مثلا یہاں مائیکل ایڈورڈز کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

"مسلم لیگ نے سکھوں کو کوئی ایسی پیشکش نہ کی کہ اگر وہ پاکستان میں آجائیں تو وہ کس کس قسم کا تحفظ حاصل کرلیں گے۔ مسٹر جناح نے سکھوں سے کہا کہ تم پاکستان قبول کرلو۔ اس کی بعد ہر ہر طرح کا انصاف مہیا کریں گے۔ یہ رویہ کسی طرح بھی حوصلہ افزا نہیں تھا۔ اسی لئے سکھوں نے ترجیح اس امر کو دی کہ پنجاب کو تقسیم کروا لیا جائے۔ بجائے اس کے کہ سارا صوبہ پاکستان کو مل جائے۔"

ظاہر ہے کہ مائیکل ایڈورز اور اسی جیسے کئی دیگر نامہ نگار اور مصنف کانگریسی پراپیگنڈا کا شکار تھے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ مسلم لیگ کے پاس فقط ایک انگریزی اخبار تھا۔ ڈان (DAWN) اور اس کی مقابل کم از کم کئی درجن زور دار انگریزی اخبار' کانگریسی نقطہ نظر کا پروپیگنڈا کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ خود برطانوی حکومت کی طرف سے بھی کانگریسی نقطہ نظر کی تائید جاری تھی۔

مائیکل ایڈورز جیسے اہل قلم کے بیان کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ سکھوں نے مسلمانوں کی بات سنی ہی نہ تھی۔ جب برعظیم کی سیاسی الجھاؤ کا واحد علاج پاکستان تسلیم کر لیا گیا اور تقسیم برعظیم کا فیصلہ ہوگیا تو اس وقت بھی قائداعظم اور لیاقت

علی خان نے سکھ قائدین سے معاملات طے کرنے کی کوشش جاری رکھی تھی' مگر ایسی ساری مساعی ناکام رہیں۔ ایم۔ اے۔ ایچ اصفہانی لکھتے ہیں:

"یہ تھا وہ نازک دور جس اثنا میں قائداعظم نے بے حد کوشش کی کہ سکھوں کو دلیل اور معقولیت کی راہ دکھائیں۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ کوئی منفی سے سکھ ریاست کی بجائے وہ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوں اور پھر اچھے برے مقدر میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ قائداعظم نے ہر اس آزادی کی ضمانت دی جو سکھوں کو درکار تھی اور انہیں یقین دلایا کہ وہ ہر طرح کی بالا دستی کے خوف سے آزاد ہوں گے اور انہیں امن اور خوشحالی کی زندگی میسر ہوگی' لیکن وہ سوجھ بوجھ کی راہ پر ہی نہ آئے۔ اور دوستی کا وہ ہاتھ قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوئے جو مسلمانوں کی طرف سے پیش کیا جا رہا تھا۔ جب آزادی کی منزل مزید قریب آگئی تو لیاقت علی خان نے شریک کابینہ اپنے رفیق بلدیو سنگھ سے اس موضوع پر بارہا گفت و شنید کی۔ خود قائداعظم نے سکھ رہنماؤں سے ملاقات کی اور انہیں یقین دلایا اگر وہ ہمارے (مسلمانوں) ساتھ شامل ہو جائیں گے تو ان کے ساتھ بڑا عادلانہ سلوک کیا جائے گا۔ عین آزادی کے لمحات کے قریب بھی قائداعظم آمادہ تھے کہ سکھوں کو ان کا الگ چھوٹا سا قومی وطن دے دیا جائے جس کی حدود مغربی پاکستان کی اندر ہوں اور جہاں انہیں روز مرہ زندگی اور ریاست کے انتظامی امور میں حقوق خود اختیاری حاصل ہوں۔"

جناب اصفہانی اپنی کتاب میں جس کا نام ہے "جناح میری نظر میں"-(JINNAH ASIK-NOW HIM) مہاراجا پٹیالہ کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ جناح صاحب نے انہیں سکھ ریاست کی پیشکش کی تھی۔ مہاراجا کے الفاظ جو مہاراجا کی یاد داشتوں سے لئے گئے ہیں' درج کئے جاتے ہیں۔ یہ یاد داشتیں ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی تھیں۔:

"چنانچہ کوئی بھی غیر جانبدار مبصر مسلم لیگ پر کی جانے والی اس تنقید پر متفق نہ ہوگا کہ مسلم لیگ نے سکھوں کی یقین دہانی اور رضا جوئی کے لئے کچھ نہیں کیا۔"

سردار نریندر سنگھ ہلیر کا کہنا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جو تباہی اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا' اس کے پیچھے کانگریسی رہنما سردار پٹیل کا ہاتھ تھا جسے کانگرس کا مرد آہن کہا جاتا تھا۔ سردار پٹیل نے ماسٹر تارا سنگھ جی کو روپیہ مہیا کیا' تارا سنگھ کو جو اس وقت اکالی دل کے صدر تھے' یہ روپیہ چیک کے ذریعے دیا گیا۔ سردار پٹیل نے ماسٹر تارا سنگھ سے مطالبہ کیا تھا کہ ان روپیوں سے ہتھیار خریدے جائیں تاکہ مسلمانوں کو قتل کر کے مشرقی پنجاب کو ان کے وجود سے پاک کر دیا جائے۔

حق یہ ہے کہ سکھ رہنماؤں نے اپنی قوم کو غلط راہ پر ڈال دیا۔ انہوں نے ہرگز یہ نہ دیکھا کہ خود ہندو تو گفت و شنید کی میز پر بیٹھ گئے ہیں تاکہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کریں۔ حد یہ ہے کہ ہندو قائد وائسرائے' وائسرائے کے مدبرین و معاونین کے ساتھ' قائداعظم کے ساتھ' قائداعظم کے معاونین کے ساتھ معاملات طے کر رہے تھے۔ کیا واقعی سکھ قائدین نے یہ نہ دیکھا کہ ہندو تو مسلمانوں کے ساتھ پنجاب سمیت اپنے وطن کی حدود معین کر رہے ہیں اور سکھوں کو انہوں نے اپنی ریاست اور آزاد وطن کے بارے میں سوچنے کی بجائے' ہتھیار تیز کرنے اور چمکانے پر لگا دیا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو قتل کرنے میں مصروف رہیں۔ کیا تاریخ کا اور ایک قوم کا المیہ نہیں ہے کہ اس کے افراد بجائے اس کے کہ اپنے وطن اور اپنی ریاست کے حصول کی خاطر لڑتے' انہوں نے ایک دوسری قوم کے اشارے پر ایک تیسری قوم کے قتل و غارت کو اپنے لئے مقصود و مراد بنا لیا۔ سکھ اپنے رہنماؤں کی مہربانی کے باعث فخر سے جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر ہندوؤں نے بھارت لے لیا تو کیا؟۔ اور اگر مسلمانوں نے پاکستان لے لیا تو کیا؟۔ ہم اس پر خوش ہیں کہ ہم نے لاکھوں کو قتل کیا' مردوں کو بھی' عورتوں کو بھی' بوڑھوں کو بھی' بچوں کو بھی' ان کے گھر جلائے' ان کی مویشی مارے' ان کی فصلیں جلائیں اور ان کی عورتیں اغوا کیں۔

اگر اس وقت سکھ رہنما ہوش و حواس میں ہوتے تو انہیں یقیناً دکھائی دیتا کہ جو کلہاڑیاں اور چھریاں' نیزے اور بندوقوں کی گولیاں وہ مسلمانوں پر چلا رہے ہیں' درحقیقت ان کی اپنی قوم اس کا نشانہ بن رہی ہے۔ سکھوں نے بھارتی پنجاب میں مسلمانوں کو قتل نہیں کیا بلکہ خود اپنے مستقبل کو تہ تیغ کر دیا۔ اور یہ سب کچھ ہندوؤں کی سیاسیانہ کارروائیوں کے باعث ہوا۔ جن کارروائیوں کی بدولت بھولی بھالی خالصہ قوم باسانی ان کا آلہ کار بن کر رہ گئی۔

تقریباً ۵۰۰ سال ہندو اس کوشش میں سرگرم رہے کہ سکھ فرقے کو ہندو فرقہ ہی قرار دیا جاتا رہے۔ اور سکھوں نے بھی ہندوؤں کے اس رویے کو قبول کئے رکھا۔ ہندوؤں کے ساتھ شادی بیاہ جاری رکھا۔ ان کے موسمی اور تمدنی میلوں میں انہی کی طرح شریک ہوتے رہے۔ ہندوؤں کے قومی مردان کبیر کو اپنا ہیرو مانتے رہے اور کبھی کوشش نہ کی کہ اپنا انفرادی تشخص بحال کریں۔ تقسیم برعظیم کے بعد جو سکھ پنجاب اور سرحد سے شرنارتھی ہو کر پاکستان سے بھارت میں منتقل ہوئے۔ انہیں بالعموم پنجاب میں آباد نہ ہونے دیا گیا۔ سکھوں کے گروہوں کو مہاراشٹر' بہار' مغربی بنگال' حیدر آباد' میسور' یو پی وغیرہ علاقوں میں منتشر کر دیا گیا۔ اور وہ جو مشرقی پنجاب میں تھے' پٹیل جی اور نہرو جی نے ان کی بھی مشکیں کس دیں۔ رفتہ رفتہ ان کی آنکھیں کھلنے لگیں اور انہوں نے اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کرنا شروع کی۔

سکھوں کا اپنے حقوق کے لئے مطالبہ کرنا ہندوؤں کو ناگوار گزرا۔ ہندوؤں کا یہی رویہ مسلمانوں کے بارے میں تھا کہ جب بھی مسلمان اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے تو ہندو شور مچاتے کہ یہ فرقہ وارانہ باتیں ہیں۔ یہ تعصب کی باتیں ہیں۔ ہندو مسلم بھائی بھائی۔ اسی طرح جب بھی بچارے اچھوت اپنے حقوق کی بات کرتے تو ہندو راہنما چلا اٹھتے کہ ہندو اچھوت بھائی بھائی۔ آریہ اچھوت ایک قوم۔ بالکل اسی طرح جب سکھوں نے اپنے قومی حقوق مانگے تو ہندوؤں نے پرانا نعرہ پھر بلند کیا کہ ہندو سکھ خونی رشتے میں مربوط ہیں۔ سکھ علیحدہ قوم کیسے ہوسکتے ہیں۔ ہندو سکھ بھائی بھائی-----

اور جب سکھ اپنے آپ کو ہندوؤں سے جدا ایک قوم قرار دینے پر مصر اور متحد ہوگئے اور اعلان کر دیا کہ وہ ہندوؤں سے بالکل جدا اور منفرد قوم ہیں اس لئے انہیں ان کے خصوصی قومی اور پنتھی حقوق دئے جائیں تو اس پر ہندو کا احتجاجی روایتی خونخوار رویہ کھل کر سامنے آگیا۔ اس رویے کا جلی الفاظ میں مفہوم یہ تھا کہ اے سکھو! تم اگر مسلمانوں اور اچھوتوں کی طرح اپنے آپ کو ہندو جاتی سے کوئی الگ معاشرہ قرار دیتے ہو تو پھر سن لو کہ اب تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو اچھوتوں اور مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

کشمیر کی معاصر تاریخ کا ایک ورق

جب شیخ عبداللہ لاہور آئے

جناب الطاف گوہر کی ایک تحریر کا خلاصہ

جناب الطاف گوہر نے جو ایوب خان کے زمانے میں ان کے خصوصی مشیر مہتم اور منتظم تھے' ایک مضمون لکھا ہے اور اس میں بتایا ہے کہ مسئلہ کشمیر پر شیخ عبداللہ اور سابق صدر ایوب میں کیا بات چیت ہوئی تھی۔ الطاف گوہر کے مطابق شیخ عبداللہ' مرزا افضل بیگ اور مولانا مسعودی کے ہمراہ لاہور آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ نہرو سے گیارہ سال بعد ان کی ملاقات ہوئی ہے اور اس ملاقات میں ان کے نقطہ نظر میں تبدیلی نظر آئی ہے۔ نہرو اب اس کے قائل ہیں کہ مسئلہ کشمیر پاکستان کے ساتھ سمجھوتہ کے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔ مسئلہ کشمیر کا کوئی بھی ایسا حل جو پاکستان کو نا منظور ہو' بے کار ہے اور یہ چل نہیں سکے گا۔ شیخ عبداللہ نے کہا کہ انہوں نے بھی نہرو سے صاف کہہ دیا ہے کہ اس دعوٰی کا کوئی جواز نہیں کہ کشمیر بھارت کا حصہ ہے۔ جو الیکشن کشمیر میں ہوئے تھے وہ ایک فراڈ تھے۔ اسے نہ پاکستان نے تسلیم کیا نہ دنیا نے اور اقوام متحدہ نے رائے شماری کی قرار داد منظور کر کے یہ واضح کردیا تھا کہ وہ کشمیر کو بھارت کا حصہ نہیں سمجھتی۔

شیخ عبداللہ نے ایوب خان کو بتایا کہ انہوں نے نہرو سے یہ بھی کہا ہے کہ ایسا کوئی تصفیہ نہیں ہوسکتا جو ہر فریق کو سو فی صد مطمئن کردے لیکن ایک ایسا واجبی سمجھوتہ ہوسکتا ہے جس کو ہر فریق قبول کرلے اور برصغیر سے کشیدگی کی جڑ ختم ہو۔ شیخ عبداللہ نے بتایا کہ انہوں نے نہرو سے یہ بھی کہا کہ آپ کی زندگی میں اگر کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوا تو بعد میں آپ کے جان نشین کے لئے اسے حل کرنا بہت مشکل ہوگا اور یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ کشمیری اپنی جدوجہد آزادی سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے' یہ جدوجہد چلتی رہے گی اور بھارت کی دولت اسے کچلنے میں ضائع ہوتی رہے گی۔

ایوب خان نے اس کے جواب میں شیخ عبداللہ کی جدوجہد اور قربانیوں کی تعریف کی اور کہا کہ دشمنان اسلام یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا اگر ایسا ہوتا تو برصغیر میں غیر مسلموں کی اکثریت نہ ہوتی' مسلماں حکمراں سیکولر طرز فکر رکھتے تھے اور پاکستان کی تحریک بھی سیکولر تھی۔ مسلمانوں نے مجبوراً اپنے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا لیکن اسے تھیا کریٹک سٹیٹ بنانے کا سوچا بھی نہیں گیا اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے ملاؤں کو دبا کر رکھا ہے جبکہ بھارت کا سیکولر ازم ایک دھوکہ ہے۔ اس کی تہہ میں ہندو ازم ہے لیکن پاکستان برصغیر میں فرقہ ورانہ امن اور ہم آہنگی چاہتا ہے اور بھارت کے ساتھ اچھے ہمسایوں کے تعلقات چاہتا ہے۔ پاکستان کو بھارتی مسلمانوں کی حالت زار پر سخت تشویش ہے۔ حالانکہ ۱۹۶۲ء میں جب نہرو یہاں آئے تھے تو ہم نے ان سے کہا تھا کہ ایشیا میں بھارت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے لیکن مرکزی کردار کے لئے اسے ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اپنی اقلیتوں اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتا ہے اور خاص طور سے پاکستان کی دوستی بھارت کے لئے بہت اہم ہے۔ ہم نے نہرو سے یہ بھی کہا کہ دونوں ممالک دفاع پر بہت رقم ضائع کررہے ہیں' یہ رقم عوام کی بھلائی کے لئے صرف ہونی چاہیے۔ فوجی ماہرین کی رائے میں برصغیر کا فوجی خرچہ ایک سو ملین ڈالر کافی ہے لیکن صرف بھارت کا ہی خرچہ ساڑھے چار سو ملین ڈالر سالانہ ہے۔

اگر بھارت پاکستان سے کشمیر کا مسئلہ طے کرلے تو چین کے خطرے کی موجودگی میں بھی بھارت اپنے فوجی اخراجات میں سو ملین ڈالر کی کمی کرسکتا ہے اور جو رقم کشمیر یا پاک بھارت سرحد پر صرف ہورہی ہے وہ بچ سکتی ہے۔ ہندو بنیادی طور پر بنیا ہے' اسے حساب کتاب سکھانے کی ضرورت نہیں لیکن افسوس یہ کہ اسے اپنا نقصان نظر نہیں آرہا ہے۔ ہم کوئی ہندوستان پر حملہ کرکے اس پر قبضہ تو نہیں کرسکتے' ہمیں تو ہر طرف سے مخالفین کا سامنا ہے یہاں تک کہ افغانستان بھی ہمارا مخالف ہے۔ بھارت کی مخالفت اگر ہم ختم کرسکیں تو یہ عین ہمارے مفاد میں ہوگا لیکن ہم کشمیر سے دستبردار نہیں ہوسکتے۔ ہمارے دریاؤں اور پانی کے لئے کشمیر اہم ہے۔ الطاف گوہر کے مطابق صدر ایوب نے واضح کردیا کہ آزاد کشمیر یا کشمیر پر پاک بھارت مشترکہ تولیت کا کوئی نظام فضول باتیں ہیں۔ ان باتوں پر عمل نہیں ہوسکتا اور ایک الگ آزاد کشمیر بین الاقوامی سازشوں کا اکھاڑہ ہوجائے گا۔ آزاد کشمیر نہ فوجی لحاظ سے قابل دفاع ہے نہ وہ اقتصادی لحاظ طور پر اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکتا ہے۔ پھر یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ پاکستان' بھارت اور کشمیر کی کوئی کنفڈریشن بن جائے۔

دوسرے دن کی ملاقات میں شیخ عبداللہ نے قائداعظم سے اپنے اختلافات کا پس منظر بیان کیا اور کہا کہ ہماری تحریک ڈوگرہ مہاراجہ کے خلاف تھی جس کو برطانیہ کی حمایت حاصل تھی مگر مسلم لیگ اس وقت برطانیہ کے خلاف موقف اختیار کرنے کے لائق نہیں تھی جبکہ کانگریس مخالف برطانیہ تحریک چلا رہی تھی۔ اس لئے فطری طور پر ہمارا ان سے اتحاد ہوا۔ قائداعظم کا تو ہمیں مشورہ یہ تھا کہ مسلم کانفرنس میں ضم ہوجاؤ اور مہاراجہ کے خلاف تحریک نہ چلاؤ۔ قائداعظم کے سامنے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ تھا جبکہ ہماری نظر صرف کشمیر کے مسلمان پر تھی۔ مسلم لیگ دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کی حلیف تھی کیونکہ ان حکمرانوں میں کانگریس سے خوف زدگی پائی جاتی تھی جبکہ مسلم لیگ پر زمینداروں جاگیرداروں کا قبضہ تھا۔ اس کے باوجود جب پاکستان بن گیا تو ہر مسلمان کی صدق دل سے یہ آرزو تھی کہ پاکستان مضبوط بنے۔

مہاراجہ کشمیر اپنی ریاست کو آزاد رکھنا چاہتے تھے لیکن قبائلی کشمیر میں گھس گئے اور لوٹ مار شروع کردی۔ اگر یہ قبائلی جموں چلے جاتے اور

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

مغرب نے یہ تہمت ہمارے سر کیوں ڈالی!

مغربی جمہوریت کی "برکات"

ہم نصف صدی سے ایک سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں

فوائد و نقصانات کا ایک حقیقت پسندانہ جائزہ

علامہ شہزادہ لطیف طاہر

اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ جدید جمہوریت ہمارے ملک میں مغربی ممالک سے در آمد ہی نہیں ہوئی بلکہ انگریزوں نے اسے ہم پر ٹھونسا ہے' اسے ہمارے ہاں رواج دینے میں بڑے سلیقہ سے منصوبہ بندی کی گئی اور اس کی ترویج کے لئے مسلسل اور شدید جدوجہد کی گئی ہے۔ پھر ان کی رخصتی کے بعد کتنے ہی موثر اور مضبوط ادارے اس کے تسلسل اور استحکام کے لئے شب و روز کوشاں ہیں۔ کیا اس جمہوریت کا ماخذ قرآن و سنت ہے ؟۔ یا اکابر اسلام نے اس موجودہ صورت میں مرتب کیا ہے ؟۔ ہم اس بحث کو آئندہ اوراق کے لئے ملتوی رکھتے ہیں' فی الحال ہم اس کی ہیت کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں ۔ اسے نفع و نقصان کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھتے ہیں۔ اس کی منزل مقصود پر سوچ بچار کرتے ہیں کہ آخری منزل پر ہمیں کوئی لعل گراں بہا ہاتھ لگتا ہے یا ریت پھانکنے کے لئے محض سراب حاصل ہوتے ہیں اور

ترسم ترسی بہ کعبہ تو اے اعرابی
کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

ہمیں اس پر بھی غور کرنا ہے کہ جن راہوں پر چل کر ہمیں منزل تک پہنچنا ہے کیا وہ راستے اتنے ہی سہل السفر ہیں جن پر ایک قوم کے تمام تر افراد ثابت قدمی سے گامزن ہوسکتے ہیں یا فلک پیما پہاڑ' بے آب و گیاہ صحرا اور بے کنار سمندر ہمیں راستوں ہی میں نگل جائیں گے۔ یا قیامت تک راہوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھرنا ہی ہمارا مقدر ہوگا۔

آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ دانشوران جمہوریت روایتی طور پر اس کی خوبیاں اور فائدے کس طرح بیان کرتے ہیں۔ چند بنیادی فائدے یہ بتائے جاتے ہیں:

۱۔ جمہوریت میں ہر فرد کو مساوی حیثیت دی جاتی ہے۔ حکومت اور قانون کی نگاہ میں چھوٹے بڑے ' امیر و غریب ' مرد عورت سب کو برابر درجہ دیا جاتا ہے۔

۲۔ ہر فرد کو مکمل آزادی اور خود مختاری حاصل ہوتی ہے۔ وہ اپنی آزاد مرضی سے اپنے حکمران خود منتخب کرتے ہیں۔ اس طرح بہترین صلاحیتوں کا حامل طبقہ بر سر اقتدار آتا ہے جو امور مملکت کو احسن طریقے سے سرانجام دینے کا اہل ہوتا ہے۔

۳۔ آزادانہ اظہار رائے کی وجہ سے عوام کے ذہن ترقی کرتے ہیں۔ ان میں تنقیدی صلاحیت ' خود اعتمادی ' جذبہ ایثار اور سیاسی شعور بیدار ہوتا ہے جس سے وہ حکومتی معاملات میں دلچسپی لینے کے قابل ہوجاتے ہیں۔

۴۔ ہر فرد اپنے حقوق و فرائض سے آگاہی حاصل کرتا ہے اور انہیں استعمال کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے لہٰذا عوام اپنے حکام پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔

۵۔ حکمران اپنے انتخاب کے لئے عوام کے دست نگر ہوتے ہیں۔ کسی غلطی یا کوتاہی پر انہیں حکومت سے محرومی یا سزاء کا خدشہ ہوتا ہے اس لئے مکمل احتیاط سے فرائض منصبی ادا کرتے ہیں اور قومی مفادات کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے گریز کرتے ہیں۔

۶۔ عوام اور حکمران میں یکساں طور پر ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے لہٰذا دونوں طبقے اپنے فرائض و اختیارات میں توازن قائم رکھتے ہیں نیز دونوں کے باہمی تعلقات خوشگوار رہتے ہیں۔۔ عوام تمام امور میں حکومت سے تعاون کرتے ہیں جس سے اسے امن و امان قائم رکھنے ' ترقیاتی کام سرانجام دینے اور انتظامی امور بجا لانے میں سہولت ہوتی ہے۔

۷۔ ملکی سطح پر بڑی بڑی تبدیلیاں پر سکون طور پر طے پاجاتی ہیں اور ملک کسی بحران میں مبتلا نہیں ہوتا۔

ان کے علاوہ بھی جمہوری نظام کے کئی فوائد بیان کئے جاتے ہیں لیکن ان کی حیثیت ضمنی ہے۔ بنیادی ترجیحات یہی ہیں جو اوپر درج کردی گئیں۔ ان فوائد کی چھان پھٹک کے لئے ضروری ہے کہ اسے دو حصوں میں منقسم کیا جائے۔ اول یہ کہ جن ملکوں میں جمہوریت ابتدائی مراحل میں ہے وہاں کے عوام اور حکومت کو جمہوریت سے کیا فائدے حاصل ہوئے ہیں اور وہ کس حد تک یا کس رفتار سے مطلوبہ نتائج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ دوئم یہ کہ جن ترقی یافتہ ممالک میں جمہوریت آخری مراحل تک پہنچ چکی ہے یا ان کے قریب تر ہے وہاں عوام نے جمہوریت کے طفیل کیا کھویا اور کیا پایا ہے۔ ہم نے جمہوریت کے فوائد جس ترتیب سے بیان کئے ہیں اسی ترتیب سے ان پر تبصرہ کرتے ہیں۔

۱۔ جمہوریت میں ہر قسم اور ہر طبقہ کے عوام کو مساوی حیثیت دی جاتی ہے۔ اگر اس کا تعلق

اختیارات میں مساوات سے ہے تو یہ ناممکن العمل بات ہے۔ اگر اختیارات مساوی تقسیم کردئے جائیں اور کسی کو کسی پر فوقیت نہ رہے تو انسانی دنیا میں کوئی نظم و نسق ہی باقی نہ رہے۔ لہٰذا ایسی مساوات کے بارے میں سوچنا بھی حماقت کے مترادف ہے۔ البتہ حقوق طلبی میں مساوات ہوسکتی ہے وہ اس طرح کہ ہر شخص کو ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے مطابق کام فراہم کیا جائے' یکساں ترقی کے مواقع ملیں بلا' امتیاز سب کو انصاف ملے' ہر فرد کے لئے ضروریات زندگی یکساں طور پر قابل حصول ہوں ' مختلف لوگوں کی اجرت میں فرق ہو لیکن ان میں بعد المشرقین نہ ہو کہ ایک کی آمدنی فراز عرش پر پرواز کررہی ہو اور دوسرا افلاس کی دلدل میں غرق ہو رہا ہو۔ اس شق پر ہم پاکستان کے پس منظر میں بات کریں گے کیونکہ اپنے مقامی حالات سے نوگرفتار ان جمہوریت ملکوں کے حالات کو بہتر طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت یہاں کے عوام تین طبقوں میں منقسم تھے۔ امیر ' غریب اور متوسط طبقہ۔ امیرلوگ اس وقت بھی موجود تھے لیکن کسی آبادی میں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ مشہور ہے کہ سارے ملک میں بائیس خاندان ایسے تھے جنہیں فی الواقع امیر کہا جاسکتا تھا۔ جو لوگ دوسرے درجہ کے امیر تھے وہ بھی ملک بھر میں چند سو سے زیادہ نہ تھے۔ غریب بھی موجود تھے لیکن ان کی تعداد بھی حدود کے دائرے میں تھی اور باوجودیکہ غیر ملکی حکمرانوں نے اس ملک کو جی بھر کو لوٹا تھا پھر بھی عوام کی اکثریت متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی تھی جو پوری طرح فارغ البال نہ تھے۔ تاہم اپنی آمدنی میں گزر بسر کررہے تھے۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ قیام پاکستان کے بعد جمہوری حکومت غریب طبقہ کو بھی متوسط سطح پر لاتی لیکن عملاً متوسط طبقہ ہی ملک میں ناپید ہوچکا ہے۔ اب یا خالص امیر رہ گئے ہیں یا مکمل غریب باقی ہیں۔ ہر شہر کے نواح میں امراء کے وسیع و بسیط شاندار بستیاں آباد ہوگئی ہیں جن سے بظاہر یہ تاثر ملتا ہے کہ ملک میں دولت کی ریل پیل ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جو سرمایہ متوسط طبقہ میں پھیلا ہوا تھا' اس کے ایک بڑے حصے کا چند لوگوں کے پاس ارتکاز ہوگیا ہے۔ اس طرح امیروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور متوسط طبقہ کی ایک بہت بڑی اکثریت کو غریبوں کی صف میں دھکیل دیا گیا ہے۔

اندازہ کیجئے کہ اس وقت گندم پانچ روپے من اور عام کپڑا تین چار آنے فی گز تھا۔ چار پانچ روپے ماہوار میں کرایہ کا مکان مل جاتا تھا چنانچہ اسی پچاسی روپے ماہوار تنخواہ کا کلرک اور دو تین روپے روز کمانے والا مزدور یا چھوٹا دوکاندا با فراغت زندگی بسر کرتا تھا۔ اب کلرک کی تنخواہ اور اسی معیار کے دیگر عوام کی آمدنی میں پندرہ گناہ کا اضافہ ہوا ہے لیکن گندم تیس گناہ 'کپڑا ساٹھ ستر گنا اور مکان کا کرایہ سوگنا زیادہ ہوگیا ہے۔ اس وقت ایک اچھے حکیم سے مریض کو ایک آنہ روز کی دوائی مل جاتی تھی' آج ٹیکہ مارکہ ڈاکٹر بھی پندرہ بیس روپے روزانہ سے کم نہیں لیتا۔ گویا علاج میں دو سوگناہ کا اضافہ ہوا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ متوسط طبقہ ملازم اور اسی آمدنی کے دیگر لوگ غریب طبقہ میں شامل ہوچکے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ آج کا کلرک پہلے سے زیادہ خوشحال دکھائی دیتا ہے تو جواب یہ ہے کہ۔

چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سر شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

یہ ظاہری ٹھاٹھ باٹھ سب رشوت کے طفیل ہیں ورنہ تنخواہ میں تو ایک کلرک اہل خانہ کو دال سے روٹی بھی نہیں کھلا سکتا۔ ملازم کو روٹی کے لالے پڑے تو اس نے رشوت کی طرف رجوع کیا' تاجر بددیانتی پر آمادہ ہوا' حصول زر کی دوڑ شروع ہوئی تو منشیات فروشی ' ذخیرہ اندوزی ' بلیک مارکیٹنگ اور سمگلنگ وغیرہ نے جنم لیا۔ انتظامیہ کے ایک حصہ نے رشوت لے کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ سیاستدانوں نے ووٹوں کے لالچ میں ان کے تحفظ کے لئے سفارشیں کیں۔ اس طرح بے شمار نئے لوگ امراء کی صفوں میں شامل ہوئے اور جن ملازموں نے رشوت سے اجتناب کیا یا جن تاجروں نے بددیانتی سے پرہیز کیا وہ روٹی کو محتاج ہوگئے۔

رشوت کا دور دورہ ہوا تو غریب آدمی کے لئے انصاف کا حصول مشکل ہوگیا۔ غریب آدمی اپنی مظلومیت کا شکوہ لے کر عدالت میں جانے کی ہمت نہ کرسکا۔ اپنے حالات کے پیش نظر اس کے لئے وکلا کی فیسیں ' منشی حضرات کی زرکشی اور دیگر اخراجات کا متحمل ہونا آسان نہ رہا۔ اس طرح غریب آدمی کے لئے انصاف کا حصول شجر ممنوعہ بن گیا۔

روزگار کی فراہمی ایک جمہوری حکومت کی ذمہ داری خیال کی جاتی ہے لیکن یہاں کوئی جمہوری حکومت بھی اس فرض سے عہدہ برآ نہ ہوسکی لہٰذا نوجوان نسل کے لئے ذرائع آمدنی کے وسیلے ناپید ہیں اور ہر طرف بے روزگاری کا عفریت پاؤں پسارے بیٹھا ہے۔ ترقی کے مواقع بھی سیاسی سفارشوں کی زد میں ہیں۔ غریب کا بیٹا کسی طرح کلرک ہو بھی جائے تو ساٹھ سال کی عمر میں کلرک ہی ریٹائر ہوتا ہے جبکہ امیر کا بیٹا بڑی سبک رفتاری سے ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔

یہ ساری معکوس ترقی جمہوریت کے سائے میں ہوئی ہے اور اس کی ذمہ داری ان سیاستدانوں پر عاید ہوتی ہے جو جمہوری سیاست کی بھول بھلیوں میں الجھ کر ان حالات پر قابو نہ پاسکے۔

ملے جو شہر میں اونچی عمارتوں کے کھنڈر
امیر شہر کا سارا کیا دھرا جانے

۳۔ جمہوریت پسندوں کا دعویٰ ہے کہ آزادانہ رائے شماری سے باصلاحیت طبقہ برسراقتدار آتا ہے لیکن تمام نو آموز جمہوری ممالک میں اس کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیتا۔ باصلاحیت طبقہ کی بجائے ہر جگہ اہل زر طبقہ برسراقتدار دکھائی دیتا ہے۔ جمہوری نظام میں کسی غریب یا درمیانہ طبقہ کے فرد کا کامیاب ہونا معجزہ سے کم نہیں ہوتا بلکہ یہ طبقے تو انتخابات میں حصہ لینے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ایک فرد واحد کو ووٹ حاصل کرنے کے لئے لاکھوں کی آبادی میں اپنا موثر پراپیگنڈہ پہنچانا پڑتا ہے جس کے لئے ہزارہا اشتہارات اور بینز چھپوانے ہوتے ہیں۔ پورے حلقہ کی دیواریں چاکنگ سے سیاہ کرنی پڑتی ہیں۔ ہر گلی اور ہر محلہ میں ورکر تیار کرکے انتخابی دفتر کھولنے ہوتے ہیں جن میں دفتری اخراجات کے ساتھ کارکنوں کے لئے چائے پانی کا بھی اہتمام لازم ہوتا ہے۔ جلسوں میں کرائے سے دعوت خورد ونوش تک اخراجات فراہم کئے جاتے ہیں۔ سماجی تنظیموں اور برادریوں کی انجمنوں سے تعاون حاصل کیا جاتا ہے۔ کئی ووٹ نقد رقم سے خریدے جاتے ہیں غرضیکہ۔

خشک ہوتا ہے لہو سیروں تن شاعر میں
تب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت

ان تمام اخراجات پر لاکھوں روپے اٹھ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اخراجات کا متحمل کوئی اہل ثروت شخص ہی ہوسکتا ہے اور امیر بھی ایسا جسے کسی نہایت آسان طریقے سے بے شمار

دولت ہاتھ لگی ہو ورنہ محنت کی کمائی کو داؤ پر کون لگائے گا۔

اعلیٰ صلاحیت کی خصوصیات کو دیکھائے جائے تو اس کے لئے صاحب ایمان ہونا ضروری ہے۔ پختہ ایمان کے بغیر خدمت انسانی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور اس جذبہ کے بغیر صلاحیت اعلیٰ مدارج طے نہیں کرسکتی لیکن ایمان پختہ ہو تو رزق حلال کے ساتھ زکوٰۃ 'صدقہ' خیرات وغیرہ کی شرائط پوری کر کے کسی کے پاس اتنی دولت کہاں جمع ہوسکتی ہے کہ لاکھوں روپے کا انتخابی جوا کھیلا جاسکے۔ جو لوگ انتخاب جیتنے کے لئے لاکھوں روپے داؤ پر لگاتے ہیں' ان کی انسانی ہمدردی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ عموماً وہ اپنے محلے کی خیراتی ڈسپنسری میں دس روپے چندہ دینا گوارا نہیں کرتے لیکن اسمبلی میں پہنچ کر قومی رہنمائی کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ یہ بات ذہن قبول نہیں کرتا کہ جو شخص محلّہ کے غریب ہمسائے سے ہمدردی نہیں رکھتا وہ پوری قوم کی ہمدردی کا جذبہ کہاں سے لے آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یا تو حب جاہ کا جذبہ شامل ہوتا ہے یا درون پردہ اپنی دولت میں اضافہ کی خواہش کار فرما ہوتی ہے۔

کیا باصلاحیت لوگ صرف وہ ہوتے ہیں جو دولت کی فراہمی کے فن میں کامیاب ہوں۔ اور وہ لوگ جن کا مطمع نظر روپیہ جمع کرنا نہ ہو اور جو زندگی کی کٹھن راہوں میں صرف دیانت کو اصول بنا کر حصول دولت کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہوں جنہوں نے خدا کا خوف اور دیانت داری اور راستبازی کو شعار بنا کر غربت کو اپنا لیا ہو وہ بھی باصلاحیت ہوسکتے ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ قومی درد اور انسانی ہمدردی رکھنے والے ایماندار باصلاحیت الیکشن بازی کی عیاشی کے متحمل نہیں ہوسکتے اور اہل زر صلاحیت کے زور پر نہیں بلکہ دولت کے بل پر حکومت کے ارفع مقامات پر قابض ہوجاتے ہیں۔

یہی اسباب ہیں جن کی بناء پر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ترقی پذیر ممالک میں عموماً ایسے لوگ بھی اسمبلیوں میں پہنچ جاتے ہیں جن کی تعلیم پرائمری سے آگے نہیں ہوتی اور ایسے افراد وزارتوں پر پہنچ جاتے ہیں جنہیں اپنے محلّہ کا انتظام چلانے کا بھی تجربہ نہیں ہوتا۔ جمہوری سیاسی کھیل میں یہ بھی تصویر کا ایک رخ ہے جس کے شیدائی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رائے شماری کے ذریعے باصلاحیت لوگ برسراقتدار آتے ہیں۔

لفظ صلاحیت کی تفصیل کے ضمن میں یہ امر بھی محل نظر ہے کہ صلاحیت کہتے کسے ہیں۔ حکومتی امور میں باصلاحیت وہ کہلواسکتا ہے جس کے پاس اتنا علم ہو کہ رموز مملکت کو پوری طرح سمجھ سکے' انتظامی امور میں اتنا تجربہ رکھتا ہو کہ عوام اور افسران و ملازمین کو بخوبی کنٹرول کرسکے' اپنے ملک کے دوستوں سے ملکی فوائد حاصل کرسکے اور داخلی و خارجی دشمنوں کو پہچان کر ان سے نپٹ سکے اور ان کے شر سے ملک کا تحفظ کرسکے' رعایا کی فلاح و بہبود کے ہر پہلو سے آشناء ہو اور اس ضمن میں اچھے مشوروں سے مستفید ہونے کے لئے ہمہ وقت تیار ہو۔ کسی اسلامی ملک میں باصلاحیت کہلوانے کے لئے مزید ان عناصر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ دینی علوم سے کما حقہ بہرہ ور ہو اور صرف یہی نہیں بلکہ اقوال و اعمال سے ثابت ہو کہ اس کے دل میں خدا کا خوف ہے اور یوم حساب کے علاوہ دنیا میں عوام کے سامنے بھی اپنا احتساب کرانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ وہ منصب کو ذاتی شان و شوکت کے لئے نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھے۔ حکومت کو اپنا حق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی امانت جانے اور اپنے احکام کی تعمیل کرانے کی بجائے احکام الٰہیہ کے نفاذ کی خواہش رکھے۔

جمہوری نظام سیاست میں صلاحیت کا مفہوم اس سے کچھ الگ ہے۔ یہاں صلاحیت ان عناصر سے ترتیب پاتی ہے کہ دولت کی فراوانی ہو' لچھے دار تقریروں سے رائے اپنے حق میں ہموار کرنے کی اہلیت ہو یا اعلیٰ درجہ کے مقرر خریدنے کی استطاعت ہو' ذرائع ابلاغ ' اخبارات وغیرہ کو اپنے ساتھ تعاون پر آمادہ کرسکے' سادہ لوح عوام کے سامنے انتہائی خوشگوار وعدے کرے' یہ وعدے قابل عمل ہوں یا محض خوابوں کی بستی سے متعلق ہوں' پورے ہوسکیں یا ادھورے رہ جائیں اس کی پرواہ کئے بغیر لوگوں کو اپنے وعدوں کا یقین دلا سکے۔ اپنے حلقہ کے ہر گلی کوچے میں اپنے ہم نوا کارکن پیدا کرے' ان سے بھی لمبے چوڑے وعدے کرے یا نقد ادائیگی پر خرید لے بہرحال کارکنوں کی ایک فوج ظفر موج تیار کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ ووٹ لیتے وقت ہر کس و ناکس کو سر پر بٹھائے خواہ بعد میں پاؤں تلے روند ڈالے۔ کسی کو فرقہ وارانہ ہم خیالی کے ذریعے قابو کرے' کسی کو برادری کے نام پر زیر اثر لائے اور کسی کو سیاسی منشور کی بنا پر اپنا ہم نوا بنالے۔ غرضیکہ اپنے جال میں ہر قسم کے شکار کا من بھاتا لقمہ تیار رکھے۔ خود تعلیم یافتہ ہو تو بہتر ورنہ اجرت پر تعلیم یافتہ لوگوں کی خدمات حاصل کرلے تو عرف عام میں وہ باصلاحیت کہلانے کا حقدار ہو جاتا ہے۔

یاد رکھیے کہ جمہوری نظام کے پیدا کردہ یہی باصلاحیت لوگ ہیں جو ترقی پذیر جمہوری ملکوں میں برسراقتدار آتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ تمام ترقی پذیر ممالک منزل کی طرف گامزن ہونے کی بجائے راستے کی ٹھوکریں کھارہے ہیں بلکہ ترقی یافتہ ممالک جنہوں نے ایشائی اور افریقی ممالک میں بڑی محنت سے جمہوریت کو رائج کیا ہے' اب اس کوشش میں ہیں کہ یہ ملک ہمیشہ جمہوریت کی اسی منزل میں جمے رہیں۔ یہ "باصلاحیت" لوگ دولت اور دیگر ذرائع کے سہارے ان لوگوں کا راستہ روکے رہیں گے جو حقیقی طور پر باصلاحیت ہیں اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ایسی ہی جمہوریت قائم رہی تو ہزاروں سال گزر جانے پر بھی ان ملکوں میں وہ لوگ سامنے نہ آسکیں گے جن کے پاس علم ہے' خلوص ہے اور قومی خیر خواہی کا جذبہ ہے۔

۳۔ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت سے خود اعتمادی' جذبہ ایثار اور سیاسی شعور بیدار ہوتا ہے۔ کیا فی الواقع اس دعوے میں کوئی حقیقت ہے۔ پاکستان کے عوام نصف صدی سے جمہوریت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ بلا شبہ اس عرصہ میں دوبار ڈکٹیٹر شپ بھی آئی لیکن دیکھا جائے تو معمولی وقفے کے ساتھ ان کے پس پردہ بھی جمہوری سیاست کا کھیل جاری رہا بلکہ امور مملکت میں جمہوری سیاستدان ان کی رہنمائی کے لئے موجود رہے۔ پھر دونوں ہی کو از خود جمہوری حکومتیں بنانے پر مجبور کر دیا گیا۔ حاصل مطلب یہ کہ جمہوریت ہربار آمروں پر بازی لے گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسی دوران جمہوریت نے عوام میں کیا خود اعتمادی پیدا کی۔

ملک میں جمہوری نظام رائج ہے اسی لئے عوام طوعاً و کرہاً انتخابات میں حصہ تو لیتے ہیں۔ ایک میلہ یا جشن سمجھ کر اس میں دلچسپی کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اعتماد سے

محروم ہیں۔ وہ ہر بار امیدواروں کے وعدوں پر امیدیں تو رکھتے ہیں لیکن دل کی تہ میں یہ احساس بھی رکھتے ہیں کہ سابقہ کی طرح موجودہ وعدے بھی ان کے حالات میں کوئی مثبت تبدیلی نہ لاسکیں گے۔ علاوہ ازیں ہمارے یہاں جھرلو کی کہانیاں زبان زد عام ہیں۔ اس کا ثبوت نہ سہی تاہم اتنا تو سوچنا پڑتا ہے کہ جو بات اتنی معروف و مشہور ہو اس میں کچھ نہ کچھ تو حقیقت ہوگی۔ اور نہ بھی ہو تو کم از کم عوام کے ذہن میں تو یہ تاثر موجود ہے کہ ممکن ہے ہم بھاری اکثریت سے ووٹ دیں پھر بھی ہمارا امیدوار ہار جائے اور ممکن ہے عوام کے ناپسندیدہ امیدوار کی کامیابی کا اعلان کردیا جائے۔ تو یہ افواہیں ہی سہی لیکن ان افواہوں کی موجودگی میں خود اعتمادی تو ختم ہو ہی جائے گی۔ اس کے علاوہ خود اعتمادی کا دشمن ایک اور عنصر ہے کہ۔

ہم خدا جانے کہاں راہ تکیں
تم خدا جانے کدھر سے گذرو

عوام ایک منشور پر ایک نمائندہ چنتے ہیں اور اسمبلی میں ہارس ٹریڈنگ ہوجاتی ہے یا ایوان میں جاکر وہ رکن اپنی پارٹی بدل لیتا ہے تو سب کے سب عوام کا کیا دھرا ضائع ہوجاتا ہے۔ چنانچہ کیسا اعتماد اور کہاں کی خود اعتمادی۔ ہمارے ہاں تو عوام میں اس نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔

جمہوریت کی گولڈن جوبلی تک پہنچ کر بھی جذبہ ایثار کا یہ عالم ہے کہ ایک طبقہ ہر جائز اور ناجائز ذریعے سے دولت سمیٹ کر اپنے بینک بیلنس میں مسلسل اضافہ کررہا ہے اور دوسرا طبقہ غربت کے گڑھے میں بتدریج گرتا جارہا ہے اور ہر قیمت پر دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ لہٰذا دونوں طبقے اپنی اپنی غرض کے بندے بن چکے ہیں اور معاشرہ اس سطح پر آگیا ہے کہ۔

ضرورتیں ہیں فقط باعث کشش ورنہ
کوئی کسی کو شناسانہ آشنا جانے

نفسانفسی کے اس عالم میں جب معاشی امور ہی میں جذبہ ایثار مفقود ہے تو دوسرے معاشرتی معاملات میں ایثار کہاں آئے گا لہٰذا یہ خیال خام بھی جمہوریت کے دیگر انہی عناصر میں سے ایک ہے جس کی چکا چوند آنکھوں کو خیرہ تو کرتی ہے لیکن عملاً اس کی حیثیت محض دیوانے کی بڑ ہے۔

باقی رہا عوام میں سیاسی شعور، تو اگر فی الواقع اس شعور کا کوئی وجود ہے تو یہ کسی حد تک تعلیم کی فراوانی سے ہی پیدا ہوسکتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں تعلیم ہی کہاں ہے۔ اگر تعلیم سے مراد محض لکھنا پڑھنا جان لینا ہے تو اس حد تک ہمارے چند فیصد لوگ تعلیم یافتہ ہیں لیکن یہ تو علم کا محض ابتدائی درجہ ہے۔ اصل تعلیم تو یہ ہے کہ کتابوں کے مطالعہ سے اپنے پیشرووں کی خوبیوں اور کوتاہیوں سے آگاہی حاصل کی جائے، ایسے ہنر سیکھے جائیں جنہیں اپنے اور دوسروں کے لئے بہتر طور پر استعمال کیا جاسکے اور مذہبی علوم سے اپنی ذات کا اور اپنے خالق کا عرفان حاصل کیا جائے تاکہ انسانیت معراج کی طرف گامزن ہو۔

لیکن ہمارا تعلیمی معیار اور اس کا مقصد کیا ہے؟۔ انگریز نے نظام تعلیم اس طرح مرتب کیا تھا کہ اس کے کاروبار حکومت کے لئے کلرک پیدا کئے جاسکیں۔ ہمارا تعلیمی نظام بھی انہی بنیادوں پر استوار ہے بلکہ معیار تعلیم اس سے بھی گیا گزرا ہے۔ آج ہمارا گریجویٹ انگریزی میں ایک خط لکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ فنی تعلیم کا یہ حال ہے کہ ہر سال چند ڈاکٹر اور کچھ اوور سیر قسم کے انجینئر بنا لینے کو معراج تعلیم سمجھ لیا گیا ہے۔ دینی تعلیم سے آج بھی ہمارے اسکول اور کالج کا طالب علم محروم ہے۔ بلکہ اسلامیات کے ایم اے سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ قرآن حکیم کے ترجمے سے بخوبی واقف ہو۔

تعلیمی میدان میں اس ترقی معکوس کے ساتھ ہم سیاسی شعور تک پہنچنے کے لئے کتنی صدیوں کا تخمینہ لگائیں گے اور اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ اس وقت تک باقی تمام دنیا اپنے شعور کو اسی جگہ جامد رکھے گی تاکہ ہم سیاسی شعور پیدا کرکے ان کی برابری تک آسکیں۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر ہمارے عوام سو فی صد تعلیم یافتہ ہوجائیں تو بھی کیا ہر فرد میں اتنی اہلیت پیدا ہوجائے گی کہ وہ قطعی طور پر درست فیصلہ کرسکے کہ ہمارے ملک کی سربراہی کے لئے کونسی شخصیت مکمل صلاحیتوں کی حامل ہے۔ ملک کے ہر فرد میں بلا استثناء اتنی صلاحیت کی امید رکھنا بجائے خود ایک مضحکہ خیز امید ہے کیونکہ ہر شخص کا ذہن ہونا ہی آئین فطرت کے خلاف ہے۔ دریں حالات سیاسی شعور کی اس طرح کی امیدیں محض خام خیالی ہے اور کسی طرح بھی قابل عمل نہیں۔

۴۔ ہر فرد کا حقوق و فرائض سے آگاہ ہونا اور حکام پر کڑی نگاہ رکھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ملک کی پوری آبادی حقیقی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر سیاسی شعور کی معراج تک نہ پہنچ جائے۔ اور یہی وہ منزل ہے جہاں تک پہنچنا انسان کی قسمت میں نہیں۔ اگر یہ محض ایک خواہش ہے تو بڑی اچھی خواہش ہے کہ کاش ایسا ہوجائے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اس مسئلہ کو مذہبی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان کی آفرینش کے ساتھ ہی ابلیسی قوتوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی تھی لہٰذا ساری دنیا کا نیکو کاروں سے بھر جانا ناممکن ہے۔ اسی طرح تمام تر انسانوں کا تعلیم یافتہ اور باشعور ہو کر صرف حقیقی باصلاحیت لوگوں کو ووٹ دینا بھی ناممکن العمل ہے۔ اول تو تمام افراد کا باشعور ہوجانا ہی محل نظر ہے، اس پر یہ ضمانت کیسے دی جاسکتی ہے کہ ہر باشعور شخص اپنی تمام ذاتی اغراض، ذاتی مفادات اور ذاتی خواہشات کو اجتماعی مفاد پر قربان کرنے کو تیار ہوجائے گا۔ اگر انسانی تاریخ میں آج تک اس کی مثال نہیں ملتی تو آئندہ اس کی کیا امید کی جاسکتی۔

آدم سے لے کے آج تک صرف ابتدائے اسلام کے چند سال ایسے دکھائی دیتے ہیں جب عامتہ الناس کی بہت بڑی اکثریت نے اجتماعی مفادات کے لئے ذاتی مفادات پس پشت ڈال دئے لیکن اس کی تہ میں مذہبی جذبہ کار فرما تھا جس میں بہتر عاقبت کے حصول کے لئے دنیاوی اغراض ترک کردی گئیں۔ اس کے برعکس جمہوریت میں صرف اچھی دنیاوی قدروں کی خاطر ترک اغراض کی تعلیم دی جاتی ہے لہٰذا حقوق سے آگاہ ہو کر اپنا قبلہ درست رکھنا اور پھر حکام منتخبہ سے ذاتی منفعت کی امید رکھنے کی بجائے قومی بہبود پر نگاہ امید رکھنا محض دیوانے کی بڑ ہے جس پر تکیہ رکھنا اپنے آپ کو دھوکہ دینا کے مترادف ہے۔

۵۔ حکمرانوں کا جمہوریت میں عوام کا دست نگر ہونا اور اس وجہ سے فرائض منصبی میں احتیاط برتنا بھی محض خام خیالی ہے۔ سیاست کوئی ایسا ادارہ نہیں جس میں شمولیت کے بعد سروس ریکارڈ درست رکھنا ضروری سمجھا جائے۔ وہ تو ملازمین کا انداز فکر ہوتا ہے کہ حکام ناراض ہوئے تو اگلے سال ترقی نہ ملے گی، سیاستدان تو خوب جانتا ہے کہ جمہوری نظام میں اعلیٰ ترین عہدہ ایک آدھ بار ہی حصے میں آتا ہے لہٰذا اس مختصر مدت میں زیادہ سے زیادہ مفادات اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ البتہ اسمبلی کی رکنیت وغیرہ کی دوبارہ اور

سہ بارہ توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کے لئے بھی شاطر سیاستدان اس قسم کے انتظامات رکھتے ہیں کہ باأثر کارکنوں کے چھوٹے موٹے کام د آشتہ آید بکار کے مصداق سنوارتے رہتے ہیں۔

بظاہر یہ بڑی دلفریب بات ہے کہ جمہوری احتساب کا خطرہ رہتا ہے لیکن حقیقت میں اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جو شخص ایک بار منتخب ہوجائے اسے اگلے انتخابات تک عہدے سے الگ کرنا عوام کے دائرہ اختیار ہی میں نہیں رہتا۔ اس لئے عملاً وہ بے دھڑک ہو کر اپنے عہدہ کی معیاد پوری کرتے ہیں۔ آج تک کسی جمہوری ملک میں یہ نہیں دیکھا گیا کہ عوام نے جس طرح حکومت کو منتخب کیا ہو اسی طرح اس کے خلاف ووٹ دے کر مقررہ معیاد سے پہلے اسے سبکدوش کردیا ہو۔ باقی رہا اگلے انتخابات میں رد کئے جانے کا خوف تو اس بارے میں وہ لوگ عوام سے زیادہ شاطر ہوتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ عوم کی یادداشت بہت کمزور ہوتی ہے۔ لہٰذا وہی پرانے شکاری نیا دام لے آتے ہیں جو پہلے سے زیادہ خیرہ کن ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر علاقہ میں چند مخصوص اہل زر لوگ ہی سیاست میں حصہ لینے والے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص ایک مرتبہ یا چند مرتبہ کامیاب ہوتا ہے۔ اور اگر وہ جیت نہ پائے اور اس کی جگہ دوسرا آجائے تو بھی چنداں فرق نہیں پڑتا کیونکہ گھوم پھر کر حکومت انہیں چند افراد کے قبضے میں رہتی ہے اور عوام حالات کے تحت مجبور ہوتے ہیں کہ ایک سے بد ظن ہوں تو عبرت حاصل کرنے کی بجائے اسی قسم کے دوسرے فرد کو منتخب کرلیں۔ اس سے تنگ آتے ہیں تو پھر پہلے کی باری آجاتی ہے ۔ اس طرح علاقائی اقتدار انہی گنے چنے افراد میں گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ چنانچہ عملاً نہ عوام کسی کا احتساب کرتے ہیں نہ کوئی سیاستدان عوام کے خوف سے اپنی روش بدلنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

اوپر کی سیاست افراد کی بجائے پارٹیوں کے گرد گھومتی ہے چنانچہ بڑے بڑے جمہوری ملکوں میں بھی یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ عوام ایک پارٹی سے تنگ آکر اس کے خلاف ووٹ دیتے ہیں لیکن چار پانچ سال بعد دوسری پارٹی سے نالاں ہو کر پھر پہلی پارٹی کو بر سر اقتدار لے آتے ہیں۔ گویا صورتیں بدل جاتی ہیں لیکن حالات جوں کے توں رہتے ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ارکان اسمبلی دیکھتے ہیں کہ ان کی پارٹی اس دفعہ کمزور دکھائی دے رہی ہے تو پہلو بدل کر دوسری پارٹی میں چلے جاتے ہیں۔ اور صورتیں بھی نہیں بدلتیں بلکہ لیبل بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا سیاست دانوں میں احتساب کا خوف عنقا ہوتا ہے وہ اس بات سے ڈرتے ہی نہیں کہ عوام کے دست نگر ہیں پھر فرائض منصبی میں اس خوف سے احتیاط کیسی؟۔

۶۔ جمہوریت کے بارے میں ایک دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ عوام اور حکمرانوں میں باہمی تعلقات خوشگوار رہتے ہیں جس سے امن و امان برقرار رہتا ہے اور حکومت کو ترقیاتی کام' امن و امان اور نظم و نسق قائم رکھنے میں عوام کی مدد ملتی رہتی ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں اس بارے میں بھی بڑے تلخ تجربات دیکھنے میں آئے ہیں۔ کسی نئی حکومت کے بر سر اقتدار آنے کے بعد چند ماہ تک تعلقات ضرور خوشگوار رہتے ہیں کیونکہ آنے والوں نے وعدوں کی بھرمار کر رکھی ہوتی ہے اور عوام وعدوں کے ایفا کے انتظار میں خوش و خرم دکھائی دیتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کی امیدیں یاس میں تبدیل ہونے لگتی ہیں کیونکہ انتخابات کے دوران عموماً بڑے ناممکن العمل وعدے کئے جاتے ہیں جن پر پورا اترنا کارکنان حکومت کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

ادھر عوام سمجھتے ہیں کہ صرف ووٹ دے کر انہوں نے تمام مسائل حل کرلئے ہیں۔ اب نو منتخب حکومت الہ دین کے چراغ کی طرح پلک جھپکنے میں انہیں زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دے گی۔ حالانکہ انتخابات ختم ہونے کے بعد منتخب نمائندے پہلے تو وزارت سازی کے چکر میں سر گرم رہتے ہیں پھر معمول کی کار گزاری میں مصروف ہوجاتے ہیں جس سے عوامی رابطہ کٹنے لگتا ہے۔ وعدے تو شاید انہیں یاد بھی نہیں رہتے اور اگر یاد بھی ہوں تو یہ بات ان کے ذہن میں ہوتی ہے کہ ہمارے لمبے چوڑے وعدے پورے ہو ہی نہیں سکتے پھر چند وعدے پورے کرنے سے کیا حاصل؟۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ان وعدوں پر توجہ دینے کی بجائے اپنے کام سنوارے جائیں۔ نوبت یہاں تک آجاتی ہے کہ ارکان اسمبلی مصروفیت کے بہانے عوام سے منہ چھپائے پھرتے ہیں اور عوام ان کے خلاف دلوں میں شکایتوں کے طومار جمع کرنے لگتے ہیں۔ اس کشمکش میں باہمی تعلقات کا خوشگوار ہونا تو درکنار سرے سے کوئی تعلق باقی ہی نہیں رہتا۔ ان حالات میں یہ توقع رکھنا کہ امن و امان اور نظم و نسق میں عوام حکومت سے تعاون کریں گے خواب و خیال بن کر رہ جاتا ہے۔

۷۔ ہم کسی حد تک اہل جمہوریت کا یہ دعویٰ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ اس نظام میں حکومت کی تبدیلی پر امن طریقے پر طے پاجاتی ہے۔ ہمیشہ تو نہیں البتہ کسی حد تک ایسا ضرور ہوتا ہے کہ کوئی حکومت انتخابات ہار کر بغیر کسی تنازعہ کے اپنا بوریا بستر سمیٹ لیتی ہے لیکن ترقی پذیر ملکوں میں اب بھی اکثر و بیشتر اس کے لئے عوام کو شدید محنت کرنی پڑتی ہے۔ لوگ کاروبار چھوڑ کر سڑکوں پر نکلتے ہیں' پولیس کی لاٹھیاں کھاتے ہیں اور قید و بند کی صعوبتوں سے گزرتے ہیں۔ کبھی کبھی سینوں پر گولیاں بھی کھانی پڑتی ہیں کیونکہ بر سر اقتدار حکومت از خود یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتی کہ عوام ان سے تنگ آچکے ہیں۔ وہ ذرائع ابلاغ پر مسلسل پراپگنڈہ جاری رکھتے ہیں اور اپنی غلطی ماننے کی بجائے بضد ہوتے ہیں کہ انہیں غلط سمجھا جارہا ہے۔ لہٰذا احتجاجی جلسوں جلسوں کا سلسلہ ختم کرنے کے لئے عموماً پولیس کو اور کبھی کبھی فوج کو اس طرح استعمال کیاجاتا ہے جیسے یہ عوام کسی دشمن ملک کی فوج ہو جو ان کے ملک پر حملہ آور ہوئی ہو۔

ترقی پذیر جمہوری ممالک میں شاذ ہی دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی حکمران نے اقتدار کو عزت نفس پر قربان کردیا ہو ورنہ بعض کے خلاف تو مہینوں تک میلوں لمبے جلوس نکلے لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ عوام پر لاٹھی چارج ہوا' وہ جیلوں میں گئے اور پولیس کا ناجائزہ تشدد برداشت کیا۔ امن و امان کے بہانے ان پر گولیاں چلائی گئیں لیکن بر سر اقتدار گروہ نے اس وقت تک کرسی نہ چھوڑی جب تک کہ کسی صاحب طاقت نے انہیں کرسی سے اتار کر جیل نہ پہنچا دیا۔

ملوکیت کے دور میں حکمران ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تو فوجیں آپس میں لڑتیں ۔ عوام ان لڑائیوں میں بہت کم ملوث ہوتے تھے۔ برصغیر میں کورو پانڈو کی مشہور لڑائی میں بھی رعایا سے بہت کم تعرض کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے دور میں قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک حکومت کئی خاندانوں میں منتقل ہوئی لیکن دہلی میں قتل عام

کے ایک دو واقعات پیش آئے۔ کبھی کبھی شہر میں نظام زندگی درہم برہم ہوا لیکن یہ افتاد بھی صرف دارالخلافہ دہلی تک محدود تھی باقی شہر محفوظ رہے اور دیہاتی زندگی میں تو پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ کون آیا اور کون گیا۔ لیکن جمہوریت کی صرف نصف صدی میں عام لوگوں پر جتنا لاٹھی چارج ہوا، جتنی گولیاں چلیں اور جتنے مخالفین کو جیلوں میں ٹھونسا گیا ان کی تعداد گذشتہ کئی صدیوں کے متاثرین کی مجموعی اقدامات سے بھی زیادہ ہے۔

کہنے کو شہر کا ہر شخص خود اپنا حاکم
پھر بھی حالات ہوئے جاتے ہیں ابتر کتنے

اس مختصر مدت میں ہندوستان میں مسلم کش فسادات کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اور ان فسادات میں شہید ہونے والے مسلمان عوام کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کرتی ہے۔ یہ بھی تو جمہوریت کا شاخسانہ ہے۔ ہندو چاہتے ہیں کہ مسلم رائے دہنگان کی تعداد کم ہوجائے اور جو باقی بچیں وہ بھی ذہنی طور پر خوفزدہ ہو کر ہندو اکثریت کے سامنے دم نہ ماریں کیونکہ جمہوری نظام میں سیاسی برتری قائم رکھنے کے لئے اتنی جانیں تباہ کردی گئیں۔ اس قسم کے تشدد خیز اور خون ریز واقعات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ جمہوریت میں انتقال اختیارات پرامن طریقے سے طے پاجاتا ہے۔

بایں ہمہ مان لیا کہ پرامن تبدیلی حکومت کی بہت سی مثالیں موجود ہیں لیکن کیا ضرور ہے کہ ہر تین چار سال بعد حکومت تبدیل کردی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس طرح اقتدار میں آنے والوں کو احتساب کا ڈر رہتا ہے اور دوسری بار کامیابی کے لئے وہ بہتر طور پر خلوص سے کام کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو بجائے خود اسی امر کا اقرار ہے کہ انتخاب کے ذریعے برسراقتدار آنے والوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا اور یہی سب سے بڑا نقص ہے کہ نووارد بساط سیاست اپنی ناتجربہ کاری کے باعث بھروسہ کے قابل نہیں ہوتے۔ نظام حکومت چلانے کا کوئی عملی تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے ان سے کوتاہیاں بھی سرزد ہوتی ہیں اور جب انہیں کچھ تجربہ ہوتا ہے تو عوام ان کی سابقہ کوتاہیوں کے پیش نظر انہیں رد کردیتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہربار نئے افراد آزمائے جاتے ہیں جس سے ملک ترقی کی بجائے مسلسل تنزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ ایک حکومت کوئی منصوبہ بناتی ہے لیکن اس پر عملدرآمد سے پہلے معیاد ختم ہوجاتی ہے۔ اس کی جگہ دوسرا حکمران آتا ہے وہ پہلا منصوبہ رد کرکے نیا منصوبہ بناتا ہے جسے تیسرا آنے والا ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا ہے۔ ہم خود نصف صدی سے یہی تجربہ کررہے ہیں۔ ہمارا کوئی طویل المیعاد منصوبہ اسی لئے کامیاب نہیں ہوسکا کہ ہر چند سال بعد نئی حکومت آجاتی ہے۔ چنانچہ ترقیاتی لحاظ سے ہم آج بھی وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے اور مقام حیرت ہے کہ اس صورت حال کے باوجود ہم ہر چند سال بعد محض اس لئے اپنے حکمران تبدیل کردیتے ہیں کہ جمہوریت میں حکمرانوں کی تبدیلی پرامن طریقے سے طے پاجاتی ہے۔ ○○

بقیہ عید ملن

ورنہ ہمارا حال تو یہ کہ ایمان کمزور پڑچکا ہے، اضمحلال کا شکار ہے اور موروثی عقیدہ بن کر رہ گیا ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن کے ذریعہ اس ایمان کو اپنے اندر پختہ کیا جائے اور جن لوگوں میں یہ سوچ پیدا ہو وہ ایک جگہ جمع ہوں، ایک جماعت بنیں، بنیان مرصوص!۔ وہ حالات کو بدلنے کے لئے کمربستہ ہو جائیں، ماحول کو بدلنے کی کوشش کریں تو یہ کوشش ان کے لئے کفارہ بن جائے گی ورنہ ہر شخص سے بازپرس ہوگی۔

اس خطاب کے بعد رفقاء نے کھانا کھایا اور یہ تھی ان لوگوں کی "عید ملن" جن کی زندگی کا عنوان یہ ہے کہ ۔

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اس لئے مسلماں، میں اسی لئے نمازی

کھانے کا بندوبست تنظیم سے محبت کرنے والے دو افراد نے کیا تھا جن کا شکریہ ادا کرنا ہم پر واجب ہے۔ اللہ تعالی انہیں جزا عطا فرمائے

ایک اور بات جو امیر محترم نے زور دے کر بیان کی، یہ تھی کہ اکیڈمی میں ایک سالہ کورس شروع ہو رہا ہے۔ یہ کورس ۲ر مئی سے شروع ہوگا لہٰذا آپ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں، ایک سال کی چھٹی لے لیں۔ اپنی زندگی میں سے ایک سال اللہ کے لئے نکال لیں اور تعلیم وتعلم قرآن کا یہ موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں۔

تیسرے دن اکیڈمی میں خواتین کا اجتماع تھا۔ اس اجتماع کو پہلے تو امیر محترم کی اہلیہ صاحبہ نے خطاب کیا اس کے بعد خود امیر محترم نے تقریر فرمائی اور ان کے فرائض یاد دلائے، تقریر کے بعد خواتین کے سوالات کے جوابات دئے۔

کورنگی کے رفقاء کی خواہش تھی کہ امیر محترم ان کے دفتر کا معائنہ کریں جو حال میں انہوں نے قائم کیا ہے۔ لہٰذا امیر محترم نے مغرب کی نماز کورنگی میں ادا کی۔ دفتر بازار کے معروف ترین چوراہے پر ہے۔ رفقاء کا جوش و خروش اس بات کا غماز تھا کہ یہاں سے بھی حق کا کلمہ بلند ہوگا، یہ بھی دعوت رجوع الی القرآن کا مرکز بن کر رہے گا۔ جو لوگ دورہ ترجمہ قرآن میں شریک رہے تھے، انہیں بلایا گیا تھا، دفتر میں موجود ۵۵ افراد سے امیر تنظیم اسلامی کورنگی جناب نوید احمد نے خطاب کیا اس کے بعد امیر محترم نے مختصر اور جامع تقریر فرمائی۔ یہ تقریب عشاء تک جاری رہی۔ کورنگی سے ایک سالہ کورس کے لئے پانچ افراد نے شرکت کا وعدہ کیا اور یوں یہ سہ روزہ پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔ ○○

کوپن برائے سالانہ رششماہی رسہ ماہی خریداری

میں ہفت روزہ "ندائے خلافت" کا سالانہ رششماہی رسہ ماہی خریدار بننا چاہتا ہوں رچاہتی ہوں ۔ براہ مہربانی درج ذیل پتہ پر پرچہ جاری کردیجئے۔ زرتعاون کی رقم مبلغ ---------- روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال خدمت ہے۔

نام ....

پتہ ....

نوٹ: (رقم ہفت روزہ "ندائے خلافت" ۳۶کے ماڈل ٹاؤن لاہور کے پتہ پر ارسال کی جائے)

بقیہ خالصہ سیاست

چنانچہ ۱۹۸۴ء کے موسم گرما سے کانگریسی اور دیگر ہندو لیڈروں کی بدولت ہندوؤں اور سکھوں کے مابین اصلی خونی رشتہ استوار ہونے لگ گیا ہے۔ ایک خونی رشتہ ہندوؤں کے پرانے دعوے پر استوار تھا' اس خونی رشتے کی بدولت سکھوں کو بھائی بندی کا دھوکہ دیا گیا اور اب خونی رشتہ سکھوں کی لاشوں پر استوار ہو رہا ہے۔ اس رشتے کا رنگ خونی ہے۔ وہ ہندو مکر کا رشتہ تھا' پانچ سو سال بحال رہا۔ یہ ایثار و قربانی کا رشتہ ہے' جو سکھ اپنے خون سے استور کر رہے ہیں' یہ ہزار ہا سال تک قائم اور مربوط رہے گا۔ مکر کی بنیادیں ڈھے جاتی ہیں مگر ایثار و قربانی پر استوار ہونے والی قلعے قائم رہتے ہیں۔OO

بقیہ شیخ عبداللہ

اس کا رابطہ بھارت سے منقطع کر دیتے تو یہ بہتر ہوتا لیکن صوبہ سرحد کے خان قیوم قبائلیوں کو بھیج رہے تھے اور انہیں شیخ عبداللہ سمیت بہت سے لوگوں کے قتل کی ہدایت کی گئی تھی۔ شیخ عبداللہ نے کہا کہ ان حالات میں جب مہاراجہ نے بھارت سے الحاق کا اعلان کیا تو اس الحاق کو ہم نے تسلیم نہیں کیا اور میں نے نہرو اور ماؤنٹ بیٹن دونوں سے کہا کہ یہ الحاق تسلیم نہیں کیا جاسکتا' کشمیری عوام کو خود فیصلہ کرنے کا حق ملنا چاہیے اور انہی کے اصرار پر بھارت نے کشمیریوں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرنے کا اعلان بھی کیا اور یہ مانا کہ آخری فیصلہ کشمیری عوام کی رائے شماری سے ہوگا۔ لیکن پاکستان نے یہ غلطی کی کہ ریاست میں مقیم بھارتی افواج کی تعداد کے سوال پر بحث شروع کردی۔ اگر اس وقت یہ بحث نہ ہوتی اور کوئی تصفیہ ہوجاتا تو یہ اچھا ہوتا۔

پھر جب ۱۹۵۳ء میں کشمیر کی تحریک آزادی میں زور پیدا ہوا تو پاکستان نے کوئی مدد نہیں کی اور محمد علی بوگرہ دہلی چلے گئے اور نہرو کو بڑا بھائی مان کر ان سے گلے ملے حالانکہ یہ بھارت کی چال تھی کہ وہ پاکستان سے مفاہمت کا تصور دے کر کشمیریوں کو پست حوصلہ کرنا چاہتا تھا۔ بعد میں امریکی روسی بلاک کی سیاست نے بھی کشمیر کے مسئلہ کو متاثر کیا۔ روس بھارت کا حامی ہوگیا۔ پھر یہ بھی تھا کہ نہرو کی کشمیر سے ایک جذباتی وابستگی تھی اور ان کے ارد گرد کشمیری پنڈتوں کا ایک وسیع حلقہ تھا جو انہیں بہت متاثر کرتا تھا۔ ونو بھاوے یہ سمجھتے تھے کہ کشمیر پر بھارت اور پاکستان کا کوئی مشترکہ نظام قائم ہوسکتا ہے۔ راج گوپال اچاریہ بھی اس طرح کے مشترکہ نظام کے حق میں تھے لیکن کشمیری اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے نہ وہ کشمیر کی تقسیم گوارا کرسکتے تھے۔ اس پر ایوب خاں نے کہا کہ کنفڈریشن یا مشترکہ نظام ہمارے لئے بھی قابل قبول نہیں ہے لیکن آپ ہمیں چھوڑ دیں اور جو مناسب سمجھیں بھارت سے تصفیہ کرلیں۔ اس پر شیخ عبداللہ نے کچھ جھجک کر کہا کہ پاکستان کے بغیر کوئی تصفیہ حقیقی تصفیہ نہیں ہوسکتا۔ کشمیر کا مستقبل پاکستان سے وابستہ ہے اور آپ کو بھارت کا دورہ کرنا چاہیے۔ وہاں راج گوپال اچاریہ' جے پرکاش نرائن اور رادھا کرشن کی طرح کے لوگوں سے بات چیت کرنی چاہیے۔ یہ رہنما پنڈت نہرو کو کسی سمجھوتہ پر لا سکتے ہیں۔

اس پر ایوب خان نے کہا کہ وہ ۲۲ر اور ۲۷ر جون کے درمیان اس سلسلہ میں بھارت کا دورہ کرینگے۔ اس موقع پر سیکریٹری خارجہ عزیز احمد کے مطابق ہماری انٹلی جینس نے غلطی کی اور ۱۹۵۳ء میں ہمیں صحیح اطلاعات فراہم نہیں کرسکی۔ جس کی وجہ سے ہم نے اس وقت کشمیریوں کی تحریک آزادی کی حمایت نہیں کی اور ہم تو آپ کی گرفتاری پر بھی بڑے حیران ہوگئے تھے کہ یہ کیا معمہ ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ایوب خان کے دورہ کی خواہش بہر حال ان کے دل ہی میں رہی کیونکہ ۲۷ر مئی کو نہرو کا انتقال ہوگیا اور شیخ عبداللہ کی ساری بات چیت اور کوشش رائیگاں گئی۔OO

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللہِ جَمِیعًا

خالد بزمی

ہماری ملت میں کیوں نہیں ہے وہ عہد ماضی کی خود شناسی
یہ بات جب بھی ہے میں نے سوچی تو بڑھ گئی روح کی اداسی
دیار مغرب کے فلسفوں سے ہمیں زمانے میں کیا ملا ہے؟
دلوں پہ دیوانگی مسلط ہے اور ذہنوں پہ بد حواسی!
ہم اہل مغرب کی پیروی کر کے کچھ بھی حاصل نہ کرسکیں گے
یقین کیجے کہ اہل مغرب کا فلسفہ ہوگیا ہے باسی!!
کسی کی عریانی تمدن کو ہم ترقی سمجھ رہے ہیں
ہمارے حق میں مفید کب ہے کسی طرح بھی یہ بے لباسی
نہ جانے یہ فرق ہم نے ذہنوں سے کیوں فراموش کردیا ہے
کہ کفر و اسلام کے تمدن میں فرق ہے سر بسر اساسی!
یہ کون کہتا ہے ہوگئی کند کفر کی تیغ جور پرور
حقیقتاً آج بھی اسی طرح خون مسلم کی ہے وہ پیاسی
ہم آج کس طرح زندگی میں یقیں سے محروم ہوگئے ہیں!
یقیں سے محروم ہو جب انساں تو اس کی ہر بات ہے قیاسی
خدا کی رسی کو چھوڑ کر ہم ادھر ادھر جب بھٹک رہے ہوں
تو اس سے بڑھ کر کوئی نہ ہوگی خدائے واحد کی ناسپاسی

مزدوروں کے عالمی دن کے موقع پر

جمعۃ المبارک — یکم مئی ۹۲ء — بعد نماز مغرب

برکت علی اسلامیہ ہال بالمقابل موچی دروازہ میں

جلسۂ خلافت

داعی تحریکِ خلافت پاکستان و امیر تنظیمِ اسلامی پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد

نظامِ خلافت

میں مزدوروں کے حقوق

کے موضوع پر خطاب فرمائیں گے

زیر اہتمام: تحریکِ خلافت پاکستان لاہور

۴-اے مزنگ روڈ نزد فیملی ہسپتال، فون: ۳۱۱۶۶۸-۳۵۸۹۷۰

36 -K,Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

قرآن آڈیٹوریم کی شاندار عمارت
جس کی وسعت سالانہ اجتماع کی نشستوں کے لیے تنگیٔ داماں کی شاکی رہی
نیچے سٹیج کا ایک منظر جسے سامعین کے لیے جلسہ گاہ کا حصّہ بنانا پڑا